# سوادِ منزل

نشور واحدی

مجموعۂ غزلیات

سنگم کتاب گھر، اردو بازار، دہلی ۶

پہلا ایڈیشن : ۱۹۶۸ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ~~تین روپے~~

Rs. 4/50 Ps.

(یونین پرنٹنگ پریس، دہلی ۶)

# اِنتساب

## اُس نیک دل، پاک نفس اور پاک طینت خاتونِ مشرق کے نام

جو محبی میاں ایس، ایم، بشیر بار ایٹ لا۔ کانپور۔ کی شریکِ حیات تھیں۔

مرحومہ بیگم صاحبہ فطرت کے اعتبار سے نسیم سحری، فیاّضی کے لحاظ سے ابر باراں، وضعداری اور اعلیٰ ظرفی میں بحرِ بیکراں، دینداری اور خدا ترسی میں آپ اپنی مثال تھیں۔

پروردگار نے جس فیاّضی کے ساتھ انہیں مسرّتوں سے نوازا تھا اُسی دریا دلی سے بنی نوعِ انساں میں بکھیر کر شادماں اور شاد کام ہونا اُن کا مزاج بنایا تھا۔ مرحومہ کا اخلاص اور اخلاق اپنے بیگانے غریب امیر کے امتیاز سے بالاتر تھا۔ ثباتِ حلیم اور حیاتِ بشیر کے اعلیٰ قدروں کی وہ آئینہ دار آج حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کے جوارِ قیوّمیت میں ابدی نیند سو رہی ہیں اور مجھے اپنی ادب نوازی اور سرپرستی سے اچانک محروم کر گئی ہیں

میں نے ان کی شفقت آمیز یاد کو چند اشعار میں سمو کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے؛

نشور واحدی

# نذرانۂ شاعر

میاں ایس ایم بشیر کی بیگم　　آپ اپنی مثال تھیں گویا
روز و شب اُن کی ذات سے روشن　　شمع بزم کمال تھیں گویا

موت اُن کی شہید کی سی تھی
حشر ہَل مِن مَزِید کی سی تھی

خاک اُن کی گئی سُوئے سرہند　　خوش نصیب ایسی ہستیاں تھیں چند
اُن کا نُورِ جبیں یہ کہتا تھا　　دل پہ دنیائے آب و خاک ہے بند

حق نے بخشا تھا اُن کو خُلقِ عمیم
زندگی اُن کی ذکرِ حق کی شمیم

یاد اُن کی دلوں سے جائے کہاں　　راستہ کب چھٹا ہے منزل سے
ایک دن یہ سفر تمام ہوا　　ہر سفینہ لگا ہے ساحل سے

اِنتساب ایک یادگار سا ہے
کارواں تو نہیں غبار سا ہے

نشور

# عرضِ ناشر

نشور واحدی صاحب کے کلام کا یہ مجموعہ جو ہمارے پاس بغرضِ طباعت ۱۹۶۲ء میں آیا تھا اور ہمارا اندازہ تھا کہ اسے فوراً چھاپ دیا جائے گا، لیکن بعض اندازے اکثر غلط ہو جاتے ہیں۔ اور یہ مدت ہفتوں سے مہینوں اور مہینوں سے سالوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ اس عرصہ میں یہ مجموعہ ہمارے پاس جوں کا توں پڑا رہا۔ اس تاخیر میں کچھ تو ہماری کوتاہیاں شامل ہیں اور کچھ مجبوریاں۔ بہر حال اسے اب آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس دوران میں نشور صاحب کی کچھ نئی غزلیں اور موصول ہوئیں جو اس کتاب کے آخر میں پیش کی جا رہی ہیں؂

ناشر

# البیلا غزل گو

(از ڈاکٹر محمد حسن صاحب پی ایچ ڈی)

غزل میں کوئی نئی بات نہ ہو تو غزل کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے اور یہ نئی بات بڑی مشکل سے میسر ہوتی ہے۔ نشور نے غزل میں تازگی اور ندرت کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی غزلوں پر آموختہ کا دھوکا نہیں ہوتا۔ وہ ایسی کیاری کی مانند ہیں جسے باغبان نے ابھی ابھی سینچا ہو۔ یہ شادابی اور شگفتگی فکر سے زیادہ اندازِ بیان کی مرہونِ منت ہے۔

نشور کو نئی نرالی تراکیب اور تشبیہیں بہت عزیز ہیں اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وہ انھیں برتنا جانتے ہیں۔ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر ان کے اشعار میں ان نئی نویلی تراکیب سے نہ ابہام پیدا ہوتا ہے نہ الجھاؤ

بلکہ اُن مضامین میں بھی جو کچھ ایسے نادر اور نایاب نہیں ہیں ایک ایسا چٹکیلا پن آجاتا ہے کہ شعر نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔

نشورؔ نے یہی البیلا پن مترنم اور رواں زمینوں کے انتخاب میں بھی قائم رکھا ہے۔ نشورؔ کی زمینیں سرمستی اور سرشاری سے چور ہیں، وہ گاتی اور گنگناتی ہیں۔ ان کی روانی اور رنگینی بہار کی مست ہوائیں اُڑتی ہوئی تتلیوں کی یاد دلاتی ہے۔ مثلاً —— کم بھی پیتے ہیں —— پیہم بھی پیتے ہیں —— "یہ نظم گریزاں ہے برہم زدنی پہلے" "ہر ذرۂ خاکی کو کرن ہم نے بنایا" "سرشار جوانی کا عالم شانوں پہ لٹیں حلقوں والی" "پیراہن رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے —— پنکھڑی ایک گلستاں سے صبا کیا لائی "نظر نظر کو ساقی حیات کہتے آئے ہیں"۔ وغیرہ وغیرہ۔

نشورؔ نے اپنی غزل کی تعریف ایک جگہ تخئیل پاکبازانہ نگہ انداز رندانہ کے الفاظ میں کی ہے۔ اس پاکبازی کی گواہی ان کی رندی سے ملتی ہے جو آلودگی سے مبرّا ہے۔ نشورؔ کو شبابیات کا شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ان کی غزل میں رندی اور سرمستی کے تذکرے اس طرح مزے لے لے کر کئے گئے ہیں کہ ریاضؔ خیرآبادی، جوشؔ، اخترؔ شیرانی کے بعد شاید ہی کسی نے اس قدر جھوم جھوم کر اس حدیث رندانہ کو بیان کیا ہو۔

نشورؔ کا نشہ ذرا گہرا ہے اور ان کی سرشاری اور مستی صرف زاہد کو

چھیڑنے کا سامان نہیں ہے بلکہ شباب کا تقاضا ہے وہ شباب جو عرفانِ ذات کی منزلوں میں یہ پکار اُٹھتا ہے ؎

تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دَورِ خرد میں — اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا
اغیار کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی — اپنے لئے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

اور کبھی اپنے جوشِ جنوں کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

خاک اور خون سے اک شمع جلائی ہے نشورؔ — موت سے ہم نے کبھی سیکھی ہے حیات آرائی

نشورؔ کی شاعری میں کس بل اور لہک اسی سے آئی ہے وہ فلسفی شاعر نہیں ہیں لیکن ایک یقین کی ٹیک اور ایک جذبے کا سہارا انھیں حاصل ہے۔ نشورؔ کی غزل روتی اور منہ بسورتی ہوئی غزل نہیں ہے بلکہ جوشِ حیات سے معمور ہے۔ نشورؔ کی غزل میں زندگی کی بڑی سجی سجائی، جاگتی، جگمگاتی تصویر ملتی ہے۔ وہ نئی نویلی دلہن کی طرح پھولوں سے مہکی ہوئی، عطر میں بسی ہوئی، کہیں محوِ آرائش، کہیں محوِ گفتار، مچلتی اٹھلاتی، گاتی، گنگناتی گزرتی ہے۔ نشورؔ کی شاعری میں پھولوں کی مہک عطر کی باس اور ناز و ادا کے ہوشربا تذکرے جگہ جگہ پر ملیں گے۔ اور یہ تذکرے محض تقلیداً نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ پھولوں کی مہک سے شاعر سچ مچ مست و سرشار ہوا ہے اور غمزہ و ادا کی ہوشربائی سے جھوم جھوم اٹھا ہے۔

زندگی کی اس عشوہ طرازی پر نشور نے شیفتگی کا زالا انداز اختیار کیا ہے، ان کا ایک شعر ہے ؎

اُسی کو زندگی کا ساز دے کے مطمئن ہوں میں
وہ حُسن جس کو حُسنِ بے ثبات کہتے آئے ہیں

نشور کی رندی اور سرمستی اسی اعتماد کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے وہ زندگی کی چیرہ دستیوں سے غافل نہیں مگر اس کے باوجود اس کی دلبری اور دل داری کے شیفتہ ہیں۔ اسی لئے نشور کی دنیا رنگ و آہنگ کی دنیا ہے، کیف و مستی کی دنیا ہے۔ بہکنے لڑکھڑانے اور لڑکھڑا کر ـــــ سنبھل کر گزر جانے کی دنیا ہے، وہ درد سے ناواقف نہیں مگر ان کی مستی ایسی مستی نہیں جسے درد کی تُرشی اُتار سکے۔

نشور کی غزلوں کی ایک خصوصیت تشبیہوں کا "حرکی تصور" ہے۔ جو کسی قدر غیر روائتی ہے۔ تشبیہہ کی اعلیٰ ترین قسم وہ سمجھی جاتی ہے، جس میں ایک غیر مرئی احساس یا تاثر کو دوسرے تاثر سے تشبیہہ دی جائے، یا ایک تصوّر کو دوسرے متحرک اور رواں تصویر سے مشابہ قرار دیا جائے، (ذوقؔ نے ابرِ سیاہ کے دوڑنے کو پیل مست سے نہیں۔ بلکہ پیل مست کے لے زنجیر جانے ـــــ کی کیفیت سے مماثل قرار دے کر، اس تشبیہہ پر بہادر شاہ ظفر کی سرکار سے انعام پایا تھا) نشور ایک جامد

شے کی تشبیہہ اکثر دوسری جامد شے سے نہیں دیتے ــــــ بلکہ ایک غیر مرئی احساس، تاثر یا تصوّر کو ــــــ متحرک کیفیات و جذبات کے ایک مرکب سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی اکثر تشبیہیں ذہن کو کسی ایک جامد اور بے جان شے کی طرف منعطف نہیں کرتیں، بلکہ ایک عمل ــــ ایک سلسلۂ خیال ــــ ایک برقی رَو ــــ کی طرف لے جاتی ہیں۔ ان کی تشبیہیں ایک مختصر "رنگین فلم" ہیں جن سے ذرا سی دیر میں مختلف مناظر آنکھوں کے سامنے گزر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی غزل سرشار جوانی کا عالم شانوں پہ لٹیں حلقوں والی ــــــ کی تشبیہیں ملاحظہ ہوں۔ یہ سب کی سب مرکب اور حسّی تشبیہیں ہیں، اور ان میں وہی متحرک کیفیت ہے جو ذہن کو جامد اشیاء کے تصوّر میں محدود کرنے کے بجائے ــــــ تخییل کے لئے لامحدود وسعت اور بے کراں آزادی کے دروازے کھول دیتی ہے۔

غالب نے کہا تھا کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی ہے، اور معنی آفرینی کی جان "نغز گوئی" ہے۔ نشور کی اچھی غزلوں میں "نغز گوئی" کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی غزلیں سجیلی ہیں، بناوٹی نہیں ہیں، اُن میں آرائش ہے مگر تصنع نہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنی شاعری کی آبیاری "خونِ جگر" سے کی ہے۔ اسی لئے ان کی کیاریاں شگفتگی اور شادابی سے لہلہا رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ صاحبانِ ذوق اس مجموعہ

ہیں دعوتِ فکر و نظر کا کافی ذخیرہ پائیں گے۔ اور قدم قدم پر ان غزلوں کا البیلا پن، رنگینی اور سرمستی ان کی دامن کشاں ہو گی۔ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

محمد حسن

رابعہ منزل، بدر باغ
علی گڑھ

۱۸ فروری ۱۹۶۲ء

سنہ ۱۹۳۰ء

سے

سنہ ۱۹۴۰ء

تک

# خمریات

کبھی سنتے ہیں عقل و ہوش کی اور کم بھی پیتے ہیں
کبھی ساقی کی نظریں دیکھ کر پیہم بھی پیتے ہیں

کہاں تم دوستوں کے سامنے بھی پی نہیں سکتے
کہاں ہم، روبروئے ناصحِ برہم بھی پیتے ہیں

خزاں کی فصل ہو، روزے کے ایام مبارک ہوں
طبیعت لہر پر آئی تو بے موسم بھی پیتے ہیں

طوافِ کعبہ بے کیفیّتِ مے ہو نہیں سکتا
ملا لیتے ہیں تھوڑی سی اگر زمزم بھی پیتے ہیں

کہاں کی توبہ، کیسا اِتّقا عہدِ جوانی میں
اگر سمجھو تو آؤ تم بھی چکھّو ہم بھی پیتے ہیں

نشورؔ آلودۂ عصیاں سہی پھر کون باقی ہے
یہ باتیں راز کی ہیں قبلۂ عالم بھی پیتے ہیں

○

دیا ساقی نے اوّل روز وہ پیمانہ مستی میں
کہ میں ناآشنا پی کر ہوا دیوانہ مستی میں

شرابِ آتشیں وہ ہے کہ دو اک گھونٹ پیتے ہی
جو ساقی ہو تو آتا ہے نظر پیمانہ مستی میں

نظر آتا ہے مجھ کو بوریا بھی تختِ طاؤسی
گدا رکھتا ہے گویا شوکتِ شاہانہ مستی میں

کوئی کہتا ہے مسجد ہے کوئی کہتا ہے باہر جا
الٰہی کیا میں بھولا ہوں رہِ میخانہ مستی میں

نشہ تھا مجھ کو اور یاروں نے چاہا چھین لیں بوتل
مگر کام آگئی کچھ جرأتِ رندانہ مستی میں

خبر کیا تھی کہ واعظ ہے یہی سمجھا کہ ساقی ہے
اٹھا اور اُٹھ کے جا لپٹا میں بے تابانہ مستی میں

مری پوجا تھی کیف انگیز نظروں کی پرستاری
مرا سجدہ تھا پیشِ ابروئے جانانہ مستی میں

قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں جا کر
نشورؔ اس وقت ہوں کچھ ہوش سے بیگانہ مستی میں

○

○

سحر کا لطف بھی جاتا ہے جلد لا ساقی
فضا تو دیکھ ستاروں کے جھلملانے کی

بنا لیا ہے فرشتوں نے آپ کے کعبہ
مگر زمیں تھی وہ میرے شراب خانہ کی

بنا بنا کے جو ہم کو مٹا ہی دینا تھا
تو کیوں پھر آپ نے تکلیف کی بنانے کی

زمانہ جس کو سمجھتا ہے آج شورِ نشور
وہ ابتدا ہے محبّت کے اک فسانے کی

○

○

رہبر جو تیری نرگسِ مے نوش ہو گئی
اصلاح قوم دل سے فراموش ہو گئی
پھر زلف زینتِ کمر و دوش ہو گئی
پھر چشمِ آرزو سے ہم آغوش ہو گئی
میں کیا کہوں کہ میں تو سراپائے عشق ہوں
حکمت بھی اس مقام میں خاموش ہو گئی
بیمارِ ہجر شام ہوئی اور تڑپ گیا
رگ رگ کسی خیال سے پُر جوش ہو گئی
دریائے غم میں ڈوب کے پیتا ہوں میں نشور
فطرت مری کہاں کی بلا نوش ہو گئی

○

پلا پلا کہ یہ رنگِ جہاں رہے نہ رہے
یہ فصلِ گل یہ گلستاں جواں رہے نہ رہے
ہوائے صبحِ تبسّم فزا چلے نہ چلے
گلوں سے قطرۂ شبنم چکاں رہے نہ رہے
اگر یہ صبحِ گلستاں نظر فروز رہی
تو یہ تجلیِ حُسنِ بُتاں رہے نہ رہے
قبا کشائیِ مستِ جمال ہو کہ نہ ہو
درازدستیِ شوق نہاں رہے نہ رہے
اگر جمال بھی محوِ تجلیات رہا
شباب حاصلِ عمرِ رواں رہے نہ رہے
اگر شباب بھی چند رے رہا نظارہ پسند
تو گلفشانیِ دورِ زماں رہے نہ رہے
رہا زمانہ بھی دلکش تو کیا شمارِ حیات
نشورؔ دامنِ ہستی کشاں رہے نہ رہے

○

○

یہاں سجدہ وہاں سجدہ معاذ اللہ دیوانہ
نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بتخانہ
جفائے بے حسابانہ ادائے دلربایانہ
کوئی انداز ہو لیکن حجابانہ حجابانہ
تری آنکھیں جمالِ یار پر ٹھہریں تو کیا ٹھہریں
نظر اک رشتۂ شبنم تجلی آفتابانہ
معاذ اللہ میخانے کے اورادِ سحرگاہی
اذاں میں کہہ گیا ہیں ایک دن یا پیر میخانہ
نشورؔ واحدی کی بھی غزل کیا خوب ہوتی ہے
تخیّل پاکبازانہ مگر انداز رندانہ

○

○

اوروں سے راہِ مصحف و زنّار پوچھیے
ہم سے سلوکِ خانۂ خمّار پوچھیے
رُتبہ شہیدِ عشق کا یا التہابِ شوق
جو کچھ بھی پوچھنا ہو سرِ دار پوچھیے
آوارگانِ شوق کی راہِ دراز سے
ذوقِ طوافِ جلوہ گہِ یار پوچھیے
کیا جانیں اِن رموز کو صوفی و فلسفی
رندوں سے کائنات کے اسرار پوچھیے
مجبور کر چکی ہیں مجھے بے زبانیاں
آنکھوں سے کیفِ لذتِ دیدار پوچھیے
شاعر سہی نشورؔ مگر اس کو کیا خبر
سامع سے زخمِ نشترِ اشعار پوچھیے

○

# کعبے میں

میں محوِ طوفِ پیہم تھا لئے پیمانہ کعبے میں
معاذ اللہ وہ میری لغزشِ مستانہ کعبے میں

جماعت کی نمازیں اور در و دیوار کے بوسے
مِلا رکھی ہے رسم مسجد و بتخانہ کعبے میں

قسم ہے نرگسِ ساقی کے مستانہ اشاروں کی
بہت یاد آئی مجھ کو گردشِ پیمانہ کعبے میں

اگر سجدہ نہ کرتا میں تو کیا کرتا کہاں جاتا
خُدا بن بن کے آیا جلوۂ جانانہ کعبے میں

حُدودِ شرع میں بھی دیکھنا پابندیٔ مسلک
طوافِ شمع ہی کرتا رہا پروانہ کعبے میں

نشورؔ آخر وہاں بھی رشتۂ ساقی نہیں ٹوٹا
تجلّی بن کے آیا شاہدِ میخانہ کعبے میں

○

○

وفا کے بعد بھی تو مائلِ جفا کیوں ہے
ترے وصال سے مشکل تری رضا کیوں ہے
وفا سکھائی ہے جب آپ نے زمانے کو
تو نام آپ کا پھر حُسنِ بے وفا کیوں ہے
زمانہ دیکھ کے بیمار ہو گیا جس کو
وہی مرے دلِ بیمار کی دوا کیوں ہے
کوئی تو راز ہے آواز میں حقیقت کا
ترانہ ہوشربا نغمہ دلربا کیوں ہے
تری سبیل میں کچھ بھی نہیں تو ناجائز
مری شراب میں کچھ ہے تو ناروا کیوں ہے
خرامِ بادِ بہاری سے کھِل گیا صحرا
چمن میں قحط نسیمِ بہار کا کیوں ہے
فضائے رُوح میں رکھتے ہوئے جمالِ ابد
نشورؔ شیفتۂ حُسنِ کم بقا کیوں ہے

○

# بیخودی

بہ خود نمایاں ہیں تری جانِ بیخودی
اللہ رے وہ خودی کہ ہے سامانِ بیخودی

ٹوٹے نظام محفل ہستی بدل گئی
بدلا نہیں مگر مرا ایمانِ بیخودی

دیوانہ ہوں مگر تجھے پہچانتا ہوں میں
مضمونِ ہوش ہے مرا عنوانِ بیخودی

دھو دے مرے ضمیر سے اسرارِ فلسفہ
اے وہ کہ تو ہے ساقیِ طوفانِ بیخودی

شعرِ غزل کہ نذر بہ چشتی کند نشور
بادے بود ز لمحۂ رقصانِ بیخودی

---

لہ ایم چشتی بیگم

○

میں بھول گیا تجھ میں محرابِ خدا خانہ
اے سجدہ گہہِ عالم اے ابروئے جانانہ
وہ جلوۂ مستانہ وہ زلفِ پریشانہ
بربادکُنِ کعبہ، غارت گرِ بُت خانہ
وہ چہرۂ رنگیں ہے نظّارہ بہ نظّارہ
وہ زلفِ مسلسل ہے افسانہ در افسانہ
تائیدِ جنوں میں ہیں کچھ عقل کے مارے بھی
اس ہوش کی دنیا میں تنہا نہیں دیوانہ
ہر جزو حکایت کا حاصل بھی ہی باطل بھی
چونکے تو حقیقت ہے نیند آئی تو افسانہ

دیوانہ محبّت ہیں معذورِ محبّت ہے
کچھ آپ سے بیگانہ کچھ حُسن سے بیگانہ
پہنچا دیا ساقی نے پایانِ حقیقت تک
پیمانہ بہ پیمانہ میخانہ بہ میخانہ
ہر گوشہ منوّر ہے دنیا کا بہ فیضِ غم
جلتا ہے چراغ اپنا کاشانہ بہ کاشانہ
اک وجد ٹپکتا ہے ہر لفظِ محبّت سے
ہے شعرِ نشورؔ آخر کس حُسن کا افسانہ

○

○

نگاہ اوّلیں کا آج تک جب نام آتا ہے
وہی رعنائیاں لے کر خیالِ خام آتا ہے

میں اُن جلووں میں دستِ شوق و ساغر بھول جاتا ہوں
کوئی رنگیں ادا لے کر جو رنگیں جام آتا ہے

مسلسل شامِ غربت شامِ فرقت شامِ بیماری
مرا دل کانپ جاتا ہے جو لفظِ شام آتا ہے

محبت اور پھر ضبطِ محبت اُف معاذ اللہ
خدا کا سامنا ہے اور کسی کا نام آتا ہے

فریبِ حسن کو بھی یاد رکھ اے تشنۂ عقبیٰ
تماشا آج کا دیکھا ہوا کل کام آتا ہے

نہ پوچھو زندگی تارِ نفس پر جینے والوں کی
کہ مرگِ ناگہاں کا ہر نفس پیغام آتا ہے

نشورؔ اُن کے غرورِ حسن کا دامن پکڑ لوں میں
مگر میری کمندِ شوق پر الزام آتا ہے

○

نفس نفس پہ مجھے یاد آئے جاتے ہیں
تمام روح تخیّل پہ چھائے جاتے ہیں

ہم ان کا ذوق محبت چھپائے جاتے ہیں
مگر یہ ابر جو ساون کے آئے جاتے ہیں

یہی سماں تھا کسی کی وداعِ آخر کا
ستارہ ہائے سحر جھلملائے جاتے ہیں

زمانہ یاد کرے یا صبا کرے خاموش
ہم اک چراغ محبت جلائے جاتے ہیں

نشورؔ آپ کے اشعارِ درد کیا کہنا
کسی کی بزمِ محبت میں گائے جاتے ہیں

عروجِ ماہ میں جب وقتِ شام ہوتا ہے
خیال آپ کا محشر خرام ہوتا ہے
محبتوں میں یہ رنگِ کلام ہوتا ہے
ہر اک نگاہ میں دل کا پیام ہوتا ہے
کسی کی یاد مصیبت کی یاد ہوتی ہے
کسی کا نام قیامت کا نام ہوتا ہے
کسی کو آتشِ ہجراں سے پھونکنے والے
بہار جاتی ہے ساون تمام ہوتا ہے
ہر ایک شعر پہ گویا پھڑک اٹھی محفل
نشورؔ آپ کا بھی کیا کلام ہوتا ہے

# ساون

مہِ ساون[1] میں جوں جوں رودِ گنگا بڑھتی جاتی ہے
تمنّا آپ کی جانِ تمنّا بڑھتی جاتی ہے
گھٹاؤں میں بہارِ آرزو جب تم نہیں ہوتے
بلائے غم بہ گلبانگِ پپیہا بڑھتی جاتی ہے
چڑھے ساون وہ اللہ رے کسی کا حسن روز افزوں
ہر اک چھینٹے پہ آبِ روئے زیبا بڑھتی جاتی ہے
وہ ہریالی وہ صحرا وہ فروغِ جلوۂ گلشن
بہارِ سبز میں برقِ تجلّی بڑھتی جاتی ہے

---

[1] میرے نزدیک اسم معرفہ کی طرف اضافت جائز ہے جس سے کوئی روایت وابستہ ہو۔ جیسے ساون۔ پپیہا۔

وہ جھولے پر کوئی نظارہ جنبانِ معاذاللہ
کھنچا جاتا ہے دل چشمِ تماشا بڑھتی جاتی ہے
ہوا برسات کی صحرا بہ صحرا ہوتی آتی ہے
گھٹا سیلاب کی دریا بہ دریا بڑھتی جاتی ہے
اُدھر تھمتا نہیں پانی اِدھر رُکتے نہیں مضمون
نشورِ واحدی کی طبعِ والا بڑھتی جاتی ہے

○

وہ وقت اور بھی جانِ شباب ہوتا ہے
جب ایک مستِ ادا بے نقاب ہوتا ہے
وہ دستِ شوق وہ آغوش جلوۂ رنگیں
نظر میں منظرِ جام و شراب ہوتا ہے
خطائے شوق پہ جب بازپرس ہوتی ہے
سوال کچھ ہو "محبت" جواب ہوتا ہے
تبسّمات کے سامانِ انبساط کے بعد
کبھی فراق بچشمِ پُرآب ہوتا ہے
نشورؔ رسمِ تغزّل ابھی رہے جاری
کہ ہوتے ہوتے کوئی انقلاب ہوتا ہے

○

# تحریر

کبھی موصول جب مطلوب کی تحریر ہوتی ہے
قیامت کا تاثر حشر کی تاثیر ہوتی ہے
تمنّا در تمنّا لذّتِ تقریر ہوتی ہے
تخیّل در تخیّل حُسن کی تصویر ہوتی ہے
اشاراتِ سخن سے شوق کے احوال کھلتے ہیں
فراست آشنائے صاحبِ تحریر ہوتی ہے
اگر حرفِ محبّت لکھ گیا ہے لکھنے والے سے
تو قرآن چھوڑ کر اس لفظ کی تفسیر ہوتی ہے
شکایاتِ جُدائی کی تمنّا خیز شکلوں سے
غمِ خاموش کی دُنیا تکلّم گیر ہوتی ہے
نشورؔ اس باغِ ہستی میں جہاں تک میں نے دیکھا ہے
محبّت سرزمینِ حُسن کی تسخیر ہوتی ہے

ذوقِ نگاہ بازیِ بیہم نہ پوچھئے
نظارۂ جمال کا عالم نہ پوچھئے

لبریز جام آپ نے دیکھا نہیں کبھی
آنکھوں کی مست خوابیِ پُرنم نہ پوچھئے

یاد آرہی ہے دیدۂ رقت نواز کی
نرگس پہ لطف قطرۂ شبنم نہ پوچھئے

جھک جھک کے کہہ رہا ہے کسی کا سرِ نیاز
زلفوں کا پیچ اور مرا خم نہ پوچھئے

ایمائے ناز ہے کہ بہ ہنگامِ گفتگو
سب پوچھئے مگر سببِ غم نہ پوچھئے

محشر میں آپ کیجئے مجرم سے باز پُرس
لیکن گناہِ الفتِ باہم نہ پوچھئے

غم خانۂ خیال میں بیٹھا ہوا نشور
کرتا ہے کب سے زیست کا ماتم نہ پوچھئے

○

دولتِ دل مری سرمایۂ ایماں میرا
حُسن نے لوٹ لیا ہر سروساماں میرا
عرضِ تفسیر ترے مُحسن کے آگے تو یہ
ایک جلوے میں فراموش ہے قرآں میرا
انقلاباتِ زمانہ سے یہ کہدے کوئی
پیکرِ شوق ہوں مٹنا نہیں آساں میرا
لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا دیکھا دل نے
"میں وہ مضموں ہوں کہ عنواں ہے انساں میرا"
آئی آواز کہ اے میرے مچلنے والے
اب تو بخشا گیا اب چھوڑ دے داماں میرا

○

○

اس کا نیاز مند ہوں جس کی نظر نظر
ہے اک فریب جنبشِ مژگاں لئے ہوئے

گذرا ہے قریب سے اک پیکرِ شباب
نیچی نظر میں حشر کا ساماں لئے ہوئے

کس بے بسی کے ساتھ بسر کر رہا ہے عمر
انسان مشتِ خاک کا احساں لئے ہوئے

نکلا پھر آفتاب پھر آئی مری سحر
شامِ فراق، شامِ غریباں لئے ہوئے

اوراق کائنات میں اب ہیں کہاں نشورؔ
افسانہ مٹ گیا مرا عنواں لئے ہوئے

○

○

رفو کا تذکرہ اے فطرتِ چالاک رہنے دے
میں اک دیوانہ ہوں مجھ کو گریباں چاک رہنے دے
نظر آتی ہیں کچھ کچھ خامیاں مشقِ تصور میں
ابھی کچھ دن خیالِ گیسوئے پیچاک رہنے دے
شکایتہائے رنگیں نالہ ہائے زار سنتا جا
کسی حد تک اسیرِ زلف کو بے باک رہنے دے
نہ اس کو لالہ و گل کر نہ اس کو صورتِ انساں
مری اس ایک مٹھی خاک کو بس خاک رہنے دے
بچھا دے جا نماز زہد لے جا کر تہہِ طوبےٰ
مرا پشمینہ دیرینہ زیرِ تاک رہنے دے
نشور آخر مٹانے پر مرے کیوں ہے تو آمادہ
مرا نام و نشاں ظالم تہہِ افلاک رہنے دے

○

○

شوق تھا شباب کا حسن پر نظر گئی
لٹ کے تب خبر ہوئی زندگی کدھر گئی

زندگی قریب ہے کس قدر جمال سے
جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی

ہے چمن کی آبرو قافلہ بہار کا
بوئے گل کا ساتھ کیا بیوفا جدھر گئی

دیکھتے ہی دیکھتے دن گزر بہار کے
فصلِ گل بھی کس قدر تیز تر گزر گئی

کیوں سکوں نصیب ہیں ہجر کی درازیاں
جیسے پیاس بجھ گئی جیسے بھوک مر گئی

کیا خبر نشورؔ تھی منزلِ حیات کی
پھول لے لیا مگر نوکِ خار اتر گئی

○

○

۱۹۴۱ء

سے

۱۹۴۶ء

تک

○

○

اُس دل کی مصیبت کون سُنے جو غم کے مقابل آجائے
کس نے یہ کہا تھا تنکے سے وہ بجلی سے ٹکرا جائے
دنیا کی بہاروں سے آنکھیں یوں پھیر لیں جانے والوں نے
جیسے کوئی لمبے قصے کو پڑھتے پڑھتے اکتا جائے
آغاز محبت ہے اور دل یوں ہاتھ سے نکلا جاتا ہے
جیسے کسی الھڑ کا آنچل سرکا جائے ڈھلکا جائے
گزرے ہوئے دلکش لمحوں کی بھولی ہوئی یاد ایسی آئی
جیسے کوئی پریتم پردیسی سوتے میں اچانک آجائے
جب پہلے پہل احساس ہوا ہے غم کا تو دل ایسا کانپا
جیسے کہ دلھن پہلی شب کی آہٹ جو ملے تھرا جائے

کنگھے سے گھنیری زلفوں میں یوں لہریں اٹھتی جاتی ہیں
جیسے کہ دھندلکا ساون کا بڑھتا جائے بڑھتا جائے
ہستی کا نظارہ کیا کہئے مرتا ہے کوئی جیتا ہے کوئی
جیسے کہ دوالی ہو کہ دیا جلتا جائے بجھتا جائے
اک آس جو دل کی ٹوٹ گئی پھر دل کی خوشی باقی نہ رہی
جیسے کہ اندھیرے گھر کا دیا گل ہو تو اندھیرا چھا جائے
دل ہے کہ نشورؔ اک باجا ہے سینے کے اندر تاروں کا
جب چوٹ پڑے جھنکار اُٹھے جب ٹھیس لگے نغمہ آ جائے

○

فطرت ہے حجابات سے تھک جائے تو کیا ہو
بجلی ہے مقابل میں چمک جائے تو کیا ہو
ٹکرائے حجابوں سے نسیم سحری۔ اور
شاخِ گلِ رنگیں سی لچک جائے تو کیا ہو
نزدیک ہی منزل گہہ جاناں ہے مگر عشق
نادیدہ مسافر ہے بھٹک جائے تو کیا ہو
گو نکہتِ داماں کو نہیں اِذنِ تجاوز
آغوشِ تمنا ہی مہک جائے تو کیا ہو
جس وقت نگاہوں میں کلی پھول رہی ہو
کانٹا سا کوئی دل میں کھٹک جائے تو کیا ہو

---

لے اس نظم میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔

دامن بھی ہے مشتاق کسی ہاتھ کا لیکن
ذوقِ پسِ پردہ ہے جھجک جائے تو کیا ہو
معشوق ہے آئینہ طلب کر لے تو کیا دُور
دوشیزہ ہے انداز بہک جائے تو کیا ہو
ایسے ہیں کہ درکار ہوں خاموش زبانیں
پیمانۂ گفتار چھلک جائے تو کیا ہو
جس وقت کہ اُمیّد پہ ہو خواب سا طاری
آواز میں چاندی سی کھنک جائے تو کیا ہو
پردہ ہے مگر دل کی سنی جاتی ہے دھڑکن
احساس کا آنچل بھی ڈھلک جائے تو کیا ہو
کلیوں کے تبسّم پہ تھرکتی ہیں ہوائیں
شاعر ہے اشاروں میں بہک جائے تو کیا ہو
مدّت پہ نشورؔ آج ہے جاگا ہوا سا کچھ
پھر خواب حسیں کوئی ٹھٹک جائے تو کیا ہو

○

○

اِدھر اُدھر سے حسن کو سمیٹتا چلا گیا
نئی نئی جوانیوں کو دیکھتا چلا گیا
جو منزلِ شباب کی طرف بڑھا تو کیا کہوں
قدم قدم پہ خاکِ دل بکھیرتا چلا گیا
نہ رنج و غم میں، بیں مٹا نہ رنگ و بو میں
تمام داغ دردؔ و دِل سے کھیلتا چلا گیا
تعلّقاتِ ظاہری کو جا بجا سے توڑ کر
یہ ڈورِ آب و خاک کی لپیٹتا چلا گیا
شکست ہو کہ فتح ہو مری روش وہی رہی
گِرا اگر کسی جگہ تو ٹیکتا چلا گیا
بڑھا جو دستِ آرزو تو دامنِ نگاہ میں
تمام کائنات کو سمیٹتا چلا گیا
خیالِ مرگ و زیست کو نشور چھیڑتے ہوئے
تمام سرنوشتِ غم کو میٹتا چلا گیا

○

# آنسو

ہاں ہاں انہیں دامانِ محبت میں جگہ دو
آنکھیں ہیں مری اور تمہارے ہیں یہ آنسو
ہر خونِ جگر کے لئے تیار ہوں اب بھی
ہارا ہوں نہ میں اور نہ ہارے ہیں یہ آنسو
غم وہ ہے جو ہر چیز کو پگھلا کے بہا دے
پانی نہیں سیّال شرارے ہیں یہ آنسو

○

غم وہ ہے جو دو ارمانوں کی تسکین میں حائل ہو جائے
جیسے کہ ہوں خشک لبِ ساحل اور بیچ میں دریا لہرائے
اس بزمِ محبت میں آکر بیٹھے تھے کہ محفل ختم ہوئی
دل کے نہ فسانے سُن پائے غم کی نہ کہانی کہہ پائے
یوں عہدِ جوانی بیت گیا اور یادِ جوانی دل میں رہی
جیسے کوئی جائے چھوڑ کے گھر اور دیپک جلتا رہ جائے
آغوشِ مسرّت میں جینا مشروط ہے غم میں مرنے پر
جو سو نہ سکے وہ کیا جاگے جو کھو نہ سکے وہ کیا پائے
تخیّل کی فرضی دنیا میں کیا مشقِ سخن کی پروازیں
شاعر تو وہی شاعر ہے نشورؔ اک شعر کہے اور تھرّائے

○

چلمن سے جو دامن کے کنارے نکل آئے
وارفتہ نگاہی کے سہارے نکل آئے
پیمانہ بکف ساتھ تمہارے نکل آئے
ہنگامۂ ہستی سے کنارے نکل آئے

اک سادگی حسن کی معصوم ادائیں
رنگین مضامین کے اشارے نکل آئے

سب بھول گئے پیچ وخم ہوش میں رستہ
اس راہ پہ کچھ عشق کے مارے نکل آئے

سب ڈوب گئے تلخیٔ ناکامیٔ غم میں
کچھ آپ کے دامن کے سہارے نکل آئے

رخصت کے وہ آنسودہ نگاہوں کی اداسی
تھی شام مگر صبح کے تارے نکل آئے

گستاخیِ باراں سے وہ پیراہنِ پُر نم
بھیگے ہوئے جلووں سے شرارے نکل آئے
رضواں سے بغاوت ہے نشورؔ اور مئے کوثر
عقبیٰ میں بھی کچھ کام ہمارے نکل آئے

○

○

سرشار جوانی کا عالم شانوں پہ لٹیں حلقوں والی
جیسے کہ چڑھے ساون میں اُٹھے بھادوں کی گھٹا کالی کالی
یہ عمر بھی ظالم کیا کہنا صہبا میں ملے جیسے پارا
ویسی ہی محبت بھی چنچل، جیسی کہ جوانی متوالی
مایوس فضاؤں میں دل کو اک آس نے ایسا تڑپایا
جیسے کہ گھٹاؤں کی رُت میں چٹکی لے جگر میں ہریالی
یوں نذرِ محبت ہوتا ہے رنگین آغازِ جوانی کا
جیسے کوئی کمسن پوجا کو، پھولوں کی چلے لے کر تھالی
بھولی سی تمنّا الفت کی یوں پہلے پہل دل میں آئی
جیسے کسی شادی کے گھر میں دولھن اُترے بھولی بھالی

پھیکا ہے جوانی کا عالم جب دل کی رگوں میں خون نہ ہو
جیسے کہ سحر ہو ہولی کی اور رنگ سے ہو بوتل خالی

احساس محبت میں کھو کر یوں دل کو ملامت کرتا ہے
جیسے کہ نشے کے عالم میں دیتا ہو کوئی بہکی گالی

اس طرح مصیبت میں رو کر ہوتا ہے سرورِ غم حاصل
جیسے کہ نہا کر اٹھنے پر، آنکھوں میں پھرے ہلکی لالی

قدرت بھی نکمّی قوموں کو دنیا سے فنا کر دیتی ہے
جیسے کسی سوکھے پودے کو چلنے میں کچل ڈالے مالی

یوں جانِ تمنّا سے مل کر آتے ہیں نشورؔ امڈے آنسو
جیسے کہ عدالت کے آگے بے باک ہو مجرم اقبالی

○

○

فضا پروردۂ عطر جوانی ہوتی جاتی ہے
جہاں وہ ہیں وہاں ہر شے سہانی ہوتی جاتی ہے
سحر اور شام یوں ہی زندگانی ہوتی جاتی ہے
زمانہ بنتا جاتا ہے۔ کہانی ہوتی جاتی ہے
اُدھر وہ کھوئے کھوئے سے اِدھر میں بہکا بہکا سا
محبت بھی شرابِ ارغوانی ہوتی جاتی ہے
وہی ہے ضبطِ غم لیکن اب آنسو آئے جاتے ہیں
وہی ہے دل مگر اب آگ پانی ہوتی جاتی ہے
گزشتہ الفتوں کا نقش گہرا ہوتا جاتا ہے
جو دنیا مٹ گئی ہے غیر فانی ہوتی جاتی ہے
نشورؔ اب اور ہی صورت ہو جینے کی تو بہتر ہے
نئی دنیا بھی نظروں میں پرانی ہوتی جاتی ہے

○

○

حقیقت جس جگہ ہوتی ہے تابانی بتاتی ہے
کوئی پردہ میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے

وہ آئے بھی نہیں اور زندگی کی رات جاتی ہے
سحر ہوتی ہے اور شمع تمنا جھلملاتی ہے

مری ناکامیِ غم ذوقِ حیرانی بتاتی ہے
یہ دُنیا دُور سے میری نظر میں جگمگاتی ہے

سکوتِ وصل کا لمحہ بھی کیا بیدار خوابی ہے
محبّت جاگتی ہے اور جوانی سوئی جاتی ہے

وہ جب سنجیدہ ہوتے ہیں ادا انگڑائی لیتی ہے
وہ جب خاموش ہوتے ہیں جوانی گنگناتی ہے

ہوائے دامنِ نکہت رساں کا واسطہ تم کو
ذرا ٹھہرو چراغِ زیست کی لو تھرتھراتی ہے

مسلسل گلشنِ ہستی میں کانٹے اس نے بوئے ہیں
یہ دنیا پھر انھیں کانٹوں سے کیوں دامن بچاتی ہے

یہی ہستی نشورؔ اک روز ہے انجامِ ہستی بھی
یہی دنیا کسی منزل میں عقبیٰ ہو کے آتی ہے

○

○

حُسن جو چودھویں برس آ کے شباب سے ملا
جیسے کہ نغمۂ لطیف، کیف شراب سے ملا

خوش وہ نہیں خفا سہی، ہاں، وہ نہیں نہیں سہی
کانوں کو ایک ذوقِ نو ان کے جواب سے ملا

پردۂ دل کے اس طرف جلوۂ بے پناہ ہے
جیسے کہ ہو چُھپا کوئی دل کے حجاب سے ملا

مدرسۂ تصورات غرقِ شرابِ شوق کر
مجھ کو کہ میں ہوں مردِ علم کچھ نہ کتاب سے ملا

آئیں جوانیاں تو بس شورِ گناہ الاماں
جیسے کہ دردِ دل کہیں آتش و آب سے مِلا

راز ہے کچھ گریز میں بات ہے کچھ بچاؤ میں
اُن کے شباب کا پتہ اُن کے حجاب سے مِلا

حسن و نظر میں کھو گیا عشق تو فیصلہ ہوا
نشّہ شراب میں کھنچا، نغمہ رباب سے مِلا

دل جو ٹھہر گیا نشورؔ درد بھی مٹ گیا وہیں
ہائے کہ نقشِ آرزو نقش بر آب سے مِلا

○

○

یوں ہی ٹھہر ٹھہر کے میں روتا چلا گیا
موتی سنبھل سنبھل کے پروتا چلا گیا

ہر نقش آرزو جو بہ عنوانِ ہوش تھا
جیسے کوئی شراب سے دھوتا چلا گیا

دشمن نے میری راہ میں کانٹے بچھا دیئے
اور میں اٹھا تو پھول ہی بوتا چلا گیا

جھولا جُھلا رہی تھی مجھے دل کی آرزو
سب جاگتے تھے اور میں سوتا چلا گیا

رنج و ملال و کیف و نشاط و بہارِ عمر
جو کچھ مجھے مِلا اُسے کھوتا چلا گیا

انجام کارِ شبنم و گل ایک ہی ساتھ
ہنستا چلا گیا کوئی روتا چلا گیا

ملتی ہوئی ہے عشق سے تقدیرِ انقلاب
ہونا تھا جو جہاں میں وہ ہوتا چلا گیا

غم کا خموش نغمۂ دل سوز بھی نشورؔ
ایک کیف سا رگوں میں سموتا چلا گیا

○

○

قامتِ دلربا پر شباب آگیا
یا سوا نیزے پر آفتاب آگیا
جاگی جاگی اُن آنکھوں کا عالم نہ پوچھ
سامنے ایک جام شراب آگیا
اک نگاہِ محبّت کی تخمیر میں
سب سمٹ کر جہانِ خراب آگیا
جھوم اٹھی ایک ارماں بھری زندگی
جب ہوائیں چلیں جب سحاب آگیا
آیئے آیئے اس طرف وہ نشورؔ
شاعرِ یادگارِ شباب آگیا

○

○

بھلا کب دیکھ سکتا ہوں کہ غم ناکام ہو جائے
جو آرامِ دل وجاں ہے وہ بے آرام ہو جائے
غمِ دل ہے مگر آخر غمِ دل کیا کہے کوئی
فسانہ مختصر ہو کر جب اُن کا نام ہو جائے
محبت رو چکی اور ماتمِ انجام باقی ہے
وہ آنکھیں اشک بھر لائیں تو اپنا کام ہو جائے
جیا لیکن مرا جینا کسی کے بھی نہ کام آیا
میں مرتا ہوں کہ شاید زندگی پیغام ہو جائے
بڑی حسرت سے انساں بچپنے کو یاد کرتا ہے
یہ پھل پک کر دوبارہ چاہتا ہے خام ہو جائے
نشورؔ احباب خوش دل کو ذرا ہنس بول لینے دو
مصیبت ہے اگر احساس شاعر عام ہو جائے

○

○

محبت اک مسلسل بدظنی معلوم ہوتی ہے
کہ اُن سے ہر ملاقات آخری معلوم ہوتی ہے
حجابوں میں نسیم زندگی معلوم ہوتی ہے
کسی دامن کی ہلکی تھرتھری معلوم ہوتی ہے
یہ دل کی تشنگی ہے یا نظر کی پیاس ہے ساقی
ہر اک بوتل جو خالی ہے بھری معلوم ہوتی ہے
مری راتوں کی خنکی ہے ترے گیسوئے پُرخم میں
یہ بڑھتی چھاؤں بھی کتنی گھنی معلوم ہوتی ہے
دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
نسیم زندگی کے سوز سے مرجھائی جاتی ہے
یہ ہستی پھول کی اک پنکھڑی معلوم ہوتی ہے
جدھر دیکھا نشورؔ اک عالم دیگر نظر آیا
مصیبت میں یہ دنیا اجنبی معلوم ہوتی ہے

○

مجھ کو حیات کے سوا چاہیے اک غمِ حیات
طبعِ غم آفریں مری رہ نہ سکی حیات پر

وہ بھی غیور و شرمگیں دل بھی نزاکت آفریں
چوٹ لگی ہے بات سے، بات بڑھی ہے بات پر

اُن کی نظر نے داد دی میرے وفورِ شوق کی
یوں وہ خفا ہوئے تو کیا میری گزارشات پر

حسن یہاں نظر فریب درد یہاں جگر گداز
ہائے کہ مٹ گیا نشورؔ جلوۂ بے ثبات پر

○

سحر اور شام سے کچھ یوں گذرتا جا رہا ہوں میں
کہ جیتا جا رہا ہوں اور مرتا جا رہا ہوں میں
تمنائے محالِ دل کو جزوِ زندگی کر کے
فسانۂ زیست کا پیچیدہ کرتا جا رہا ہوں میں
گلِ رنگیں یہ کہتا ہے کہ کھِلنا حُسن کھونا ہے
مگر غنچہ سمجھتا ہے نکھرتا جا رہا ہوں میں
مرا دل بھی عجب اک ساغرِ ذوقِ تمنا ہے
کہ ہے خالی کا خالی اور بھرتا جا رہا ہوں میں
بہت اونچا اُڑا لیکن اب اس اوجِ تخیل سے
کسی دنیائے رنگیں میں اُترتا جا رہا ہوں میں
جوانی جا رہی ہے اور میں محوِ تماشا ہوں
اُڑی جاتی ہے منزل اور ٹھہرتا جا رہا ہوں میں
نشورؔ آخر کہاں تک فکرِ دنیا دل دکھائے گی
غمِ ہستی کو ذوقِ شعر کرتا جا رہا ہوں میں

○

○

اپنی دنیا خود بہ فیضِ غم بنا سکتا ہوں میں
اک جہانِ شوق تا محکم بنا سکتا ہوں میں

میری آنکھوں میں ہیں آنسو تیرے دامن میں بہار
گل بنا سکتا ہے تو شبنم بنا سکتا ہوں میں

دل کے باجے میں نہیں معلوم کتنے تار ہیں
حسن کو اک تار کا محرم بنا سکتا ہوں میں

زندگی کو میں نے بخشی ہے متاعِ صد فریب
راستہ سیدھا ہے پیچ و خم بنا سکتا ہوں میں

عشق ہوں میرے لئے پاسِ حدودِ ہوش کیا
ہو کے دیوانہ بھی اک عالم بنا سکتا ہوں میں

جس قدر آنسو گرے اتنا ہی انساں ہو سکا
زندگی شاید بقدرِ غم بنا سکتا ہوں میں

خود شناسی کی شرابِ آتشیں بھر کر نشورؔ
کاسۂ مفلس کو جامِ جم بنا سکتا ہوں میں

○

○

وہ انساں کیا جو بیگانہ ہو ذوقِ زخم و خنجر سے
وہ میکش کیا جسے صہبا کی تلخی ناگوار آئے

نگاہیں کیا ملیں خوابیدہ اندازوں نے کروٹ لی
قیامت سو رہی تھی جیسے ہم جا کر پکار آئے

بتاؤں کیا تجھے حاصل فریبِ زندگانی کا
جو پایا تھا وہ کھو آئے جو جیتا تھا وہ ہار آئے

گئے ہم بار بار اُس بزمِ رنگیں میں تو کیا حاصل
وہی دامن جھٹک دے جس کے دامن پر غبار آئے

نشورؔ اب زندگی پیمائشِ غم کے سوا کیا ہے
شبِ رخصت اگر گزرے تو شامِ انتظار آئے

○

○

میں نظر نظر پہ مچل گیا میں قدم قدم پہ ٹھہر گیا
تری کائناتِ شباب میں، میں جوان ہو کے جدھر گیا

یہ خرام ناز پہ مٹ گیا وہ شباب عمر پہ مر گیا
جو، جوانیوں سے گزر گیا وہ قیامتوں سے گزر گیا

دل و دلربا کا وہ ساتھ ہے کہ اُڑے تو دونوں ہی اُڑ گئے
مری آہ تا بہ فلک گئی ترا حُسن تا بہ قمر گیا

یہ زمیں بھی تھی یہ فلک بھی تھا مگر اک شباب کی تھی کمی
تری زلف تا بہ کمر گئی تو جہانِ حُسن سنور گیا

جو لہو بچا مری آنکھ سے وہ ضیائے کون و مکاں ہوا
جو نہ اشک بن کے ٹپک سکا وہ ستارہ ہو کے بکھر گیا

ہے جمالِ یار میں جزر و مد جو مثالِ نغمۂ زیر و بم
یہ تغیرات شباب ہیں یہ نشہ نہیں کہ اُتر گیا

یہ محبتوں کا اثر ہے کیا کہ نشورؔ ایک نگاہ میں
جو طرب فزا تھا ابھی ابھی وہی نغمہ درد سے بھر گیا

○

○

تغیّرات کے عالم میں زندگانی ہے
شباب فانی، نظر فانی، حسن فانی ہے
تمام عالم ہستی پہ حکمرانی ہے
مرا جہان ہے جب تک مری جوانی ہے
میں شاد ہوں تو زمانے میں شادمانی ہے
شراب لاؤ کہ عالم تمام فانی ہے
ترے خیال سے ہے مستیٔ نظر میری
تری نگاہ سے میں نے شراب چھانی ہے
ترا جمال فسانوں میں رنگ بھرتا ہے
ترے شباب سے دلکش مری کہانی ہے
مری حیات میں جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
ترے بغیر بھی کیا خاک زندگانی ہے
دل فسردہ میں ہوتی ہے زندگی پیدا
نشورؔ جرعۂ صہبا بھی زندگانی ہے

○

○

# ۱۹۴۷ء

# سے لے کر

# ۱۹۵۷ء

# تک کی

# غزلیں

○

پیراہنِ رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے
معصوم ہے کیا جانے دامن کہیں جلتا ہے

میری مژۂ غم پر لرزاں ہے حقیقت سی
اُن کے لبِ لعلیں پر افسانہ مچلتا ہے

اچھی ہے رہے تھوڑی یہ جلوہ طرازی بھی
رقصِ مہ و انجم میں دیوانہ بہلتا ہے

عنوانِ ترقی ہے یہ تیرہ فضائی بھی
کچھ گرد بھی اٹھتی ہے جب قافلہ چلتا ہے

ہے شام ابھی کیا ہے بہکی ہوئی باتیں ہیں
کچھ رات ڈھلے ساقی میخانہ سنبھلتا ہے

بس دیکھ چکی دنیا یہ بزم فروزی بھی
رکھا ہے چراغ ایسا بجھتا ہے نہ جلتا ہے

اک سحرِ شبستاں ہے یہ فنِ جہاں رانی
دنیا ہے کہ سوتی ہے جادو ہے کہ چلتا ہے

افلاس کے آنسو سے طوفاں بھی لرزتے ہیں
شعلوں کا جگر گویا شبنم سے دہلتا ہے

مطرب بہ لبِ لعلیں ساقی بہ مئے و مینا
اس گرمیٔ محفل میں ایمان پگھلتا ہے

○

○

دنیا کو خبر کیا کہ کسی سادہ ادا نے
اشکِ پسِ مژگاں سے بدل ڈالے زمانے
خود جل کے مرتب کئے محفل کے فسانے
پروانوں کو دعوت ہی نہ دی شمعِ حیا نے
رستہ وہی شاداب ملا لالۂ وگل سے
جس راہ کو سینچا تھا کسی آبلہ پا نے
ہستی کی طرف دیکھ کے ہستی کو نہ دیکھا
مرنا بھی سکھایا ہے مجھے جینے کی ادا نے
ہر راہ میں نقش کفِ پا گرم سفر ہیں
وہ کام کیا قافلۂ بادِ صبا نے
اخلاص کو فرصت نہ ملی کوئے بتاں سے
کعبہ کو بسایا انھیں سجدات ریا نے
بیچاں ہے سرِ راہ نشورؔ آج کی دنیا
وہ گرد اڑائی ہے زمانے کی ہوا نے

○

راستہ اس نے محبت کا جُدا رکھا ہے
رہرو شوق کو بھی آبلہ پا رکھا ہے

شیشۂ و جام کے اس دورِ تحسر پہ نہ جا
سلسلہ گردش دوراں سے ملا رکھا ہے

زاہد خشک بھی خلاّق جہانِ نَو ہے
ایک عالم کا دو عالم نو بنا رکھا ہے

کتنے آزاد ہیں دنیا میں تری اہل ستم
فیصلہ جیسے قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے

سازِ ہستی کا کوئی تار شکستہ نہ سمجھ
نغمہ دلگیر تھا بے صوت و صدا رکھا ہے

عشق نے کچھ نہ کیا تیرہ شبی میں لیکن
اک چراغ تہہ دامن تو جلا رکھا ہے

وقت نے کام لیا بادِ خزاں سے لیکن
ایک جھونکا ابھی صرصر کا بچا رکھا ہے

شعر محدود نہیں حسن تخیل پہ نشور
اُن نگاہوں نے بھی اک شعر جُدا رکھا ہے

○

زندگی گرمیِ احساس پہ نازاں ہے ابھی
ذوقِ آتش ہو تو ہر شعلہ گلستاں ہے ابھی

دوش تک سلسلۂ گیسوئے پیچاں ہے ابھی
حسن مضمونِ مہ و مہر کا عنواں ہے ابھی

چشمِ ساقی میں ابھی تھوڑی سی مے باقی ہے
کوئی بہکے تو بہکنے کا بھی ساماں ہے ابھی

پھول بھی نکہتِ آوارہ کی اک منزل ہے
آدمی اپنے خیالات کا زنداں ہے ابھی

راستہ دیکھ رہی ہے کہ زمانہ بدلے
ہائے وہ قوم جو منّت کشِ دوراں ہے ابھی

تیرہ بختی میں بھی مرنا نہیں آساں نشورؔ
زندہ رہنا ہے کہ خود موت نگہباں ہے ابھی

○

○

دانستہ بیخودی بھی جمالِ حیات ہے
سمجھی ہوئی ادا کو نہ سمجھیں تو بات ہے

یہ انقلاب گردشِ لات و منات ہے
دنیا ابھی صنم کدۂ واقعات ہے

بہکے ہوئے قدم سے خراماں ہے زندگی
ہستی تمام لغزشِ پائے ثبات ہے

نشتر چبھا گئی ہیں زمانے کی کروٹیں
ٹپکا ہوا سا خونِ رگِ کائنات ہے

تہذیبِ نو کی صبح کا دھوکا ہے یہ فروغ
عالم ہنوز ایک اُجالی سی رات ہے

ہر سانس میں ہے تلخیِ صد شامِ غم نشورؔ
تا صبحِ مرگ فاصلۂ صد حیات ہے

○

○

کام لیتے ہیں جو ایجاد نظر سے پہلے
نور خورشید بناتے ہیں سحر سے پہلے

میری پلکوں سے کوئی پوچھے تاریخ سرشک
کتنی آنکھوں میں یہ صہبا تھا گھر سے پہلے

عشق نے جب کوئی عالم میں فسانہ لکھا
ابتدا کی تو تری زلف و کمر سے پہلے

وعدۂ دوست کے نزدیک وہ اشکوں کا طلوع
کچھ ستارے نکل آئے تھے قمر سے پہلے

منزل غم سے بہت دور لٹا میرا جنوں
کتنے گلزار ملے داغ جگر سے پہلے

عقل بھی بعد میں ٹھوکریں کھا کر پہنچی
عشق گزرا تھا تری راہ گزر سے پہلے

توڑ ڈالے ہیں تمناؤں کے کچھ تار بستور
کچھ تو اسباب سمیٹے ہیں سفر سے پہلے

○

○

دنیا سنور گئی ہے نظامِ دگر کے بعد
منزل پہ آگئی ہے مشیّت سفر کے بعد

جیسے دل و نظر کے حجابات اُٹھ گئے
عالم خبر کا ہے نگہہ بے خبر کے بعد

لالے میں رنگ ہے پہ کہاں یہ لہو ترنگ
دنیا حسین ہے مرے ذوقِ نظر کے بعد

بیتی ہوئی حیات محبت کا تذکرہ
شام و سحر کی یاد ہے شام و سحر کے بعد

میں آگیا سکوت و تبسّم کے درمیاں
وہ مسکرا دئے سخن مختصر کے بعد

ہر راستے کو لوٹ لیا اعتماد نے
رہزن بھی ایک شے ہے مگر راہبر کے بعد

تاریکیٔ حیات میں رخشاں ہے حسنِ دوست
جلوے کہاں رہیں گے ہجومِ نظر کے بعد

حاصل ہے کائنات کا دردِ دلِ حیات
دنیا میں کیا رہا مری آہِ سحر کے بعد

منزل پہ چھڑ گئی ہے کدورت کی داستاں
ہر کارواں نے گرد اڑائی سفر کے بعد

نقشِ قدم کی آنکھ کھلی تیری راہ میں
رستے بھی سو گئے ہیں تری رہگزر کے بعد

اہلِ ہنر کو دیکھ رہا ہوں غمیں نشورؔ
دنیا ہنر ہے راس بھی آئے ہنر کے بعد

○

○

ہر ذرۂ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا
تھا حسن مگر اک نگہہِ نیم رضا سے
گیسو بہ کمر لالہ شکن ہم نے بنایا
صد شکر کہ ہے ان کا تبسم بھی ہمیں پر
کلیوں میں جنھیں غنچہ دہن ہم نے بنایا
اغیار کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی
اپنے لئے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا
ہر جذبۂ آزادی فطرت کو ہوا دی
ہر بادۂ پیمانہ شکن ہم نے بنایا
تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

ڈرتے ہیں خموشی سے ہماری مہ و انجم
چُپ رہ کے وہ اندازِ سخن ہم نے بنایا
ٹکرائے کبھی موج سے ساحل پہ کبھی ہیں
بہتے ہوئے دریا میں وطن ہم نے بنایا
مستقبلِ تہذیب کا نغمہ وہی ٹھہرا
جو زمزمۂ گنگ و جمن ہم نے بنایا
اشکوں سے ہمارے ہے منوّر نئی دنیا
شبنم کو ضیا دی تو کرن ہم نے بنایا
آفاق کا ہر جلوہ تشوّر اس میں عیاں ہے
مل جل کے وہ آئینۂ فن ہم نے بنایا

○

○

یہ موت ہے کہ زیست تمنّا ہے یا فریب
رکتا ہے کیوں قدم کوئی منزل قریب ہے
نشتر کھٹک رہا ہے رگ جاں کے آس پاس
بس اے نگاہ ناز اِدھر دل قریب ہے
دنیا کو میں نے تیرے ہی غم سے سمجھ لیا
محفل سے شمع، شمع سے محفل قریب ہے
مدّھم سے پڑ گئے ہیں تلاطم کے زمزمے
طوفاں یہ کہہ رہا ہے کہ ساحل قریب ہے
میں دیکھتا ہوں وقت کی نازک کلائیاں
خنجر اُٹھا سکیں گے نہ قاتل قریب ہے
خاموش نہیں ہے نغمۂ زنجیر آج بھی
زنداں کہیں ہے شور سلاسل قریب ہے

انسانیت ہے فطرتِ آزاد کا پتہ
حق دُور ہے یہاں سے نہ باطل قریب ہے

واعظ نے دَورِ جام پہ تنقید چھوڑ دی
وہ بھی ہوا اس ثواب میں داخل قریب ہے

اک سلسلہ روایتِ نَو کا بھی تھا نشورؔ
غالب سے رنگِ رفتہ بیدلؔ قریب ہے

○

ہمہ گریہ سلکِ شبنم ہمہ اشک بزمِ انجم
جو نہ گل بھی مسکرائے تو کہاں رہے تبسّم

نہ مجالِ عرضِ شکوہ نہ اجازتِ تکلّم
تری زندگی خموشی مری زندگی تلاطم

نہ خطا مری نظر کی نہ گنہ ترے کرم کا
کہ نصیبِ عاشقاں ہے یہ شکستِ بے تصادم

مری حسرتیں پشیماں مری کروٹیں غم آگیں
تری رات رنگ و نکہت تری نیند ماہ و انجم

تھی بھری بہار لیکن گل و بوئے گل نے سمجھا
نگہِ چمن سے چھپ کر جو کبھی ملے ہیں ہم تم

کہیں برق جگمگائی کہیں پھول مسکرائے
جو ترے لبوں کو چھو کر ہوا منتشر تبسّم
کوئی راہ ہے محبّت تو ہجوم ہے جوانی
کہیں پاؤں ڈگمگائے کہیں زندگی ہوئی گم

یہ ادائے ملتفت ہے کہ حجابِ کم نگاہی
ترے رخ پہ رنگِ رُخ کا یہ تھکا تھکا تلاطم
کہیں مل گئے کنارے رہ و رسمِ آرزو کے
غمِ دل کو چھو رہا ہے یہ سکوتِ پُر تکلّم

جسے غم سے کچھ ملا ہے وہی ہم نفس ہے میرا
جو شکستہ سازِ دل ہو تو سنو مرا ترنّم

○

○

یہ "نظمِ گریزاں" ہے برہم زدنی پہلے
زاہد کی طرف سے ہو توبہ شکنی پہلے

پھولوں کے تبسّم پر رونا ابھی آنا ہے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے ویراں چمنی پہلے

یوں حسن کے چہرے پر آئی نہیں برنائی
سو شام کے پردوں میں اک صبح چھنی پہلے

یہ عیش کے ہنگامے اٹھتے ہوئے بادل ہیں
ہوتی ہے نگاہوں میں ہر چھاؤں گھنی پہلے

تسخیرِ جہاں اکثر تہذیبِ جنوں میں ہے
عالم شکنی چاہے کر خود شکنی پہلے

رندوں نے اگر توڑا پیمانہ تو کیا شکوہ
ساقی کی طرف سے تھی پیماں شکنی پہلے

انعام عمل شاید کچھ یوں ہی مقرر ہے
گل پیرہنی آخر رنگیں کفنی پہلے

اک نیم تبسم سے ہوتا ہے چمن زندہ
عیسیٰ نفسی سیکھے غنچہ دہنی پہلے

بے مہریِ ساقی کی تخلیق ہے ہُشیاری
میخانے میں زاہد کی توبہ بھی بنی پہلے

ہر نغمہ نشورؔ اب بھی ممنونِ تغزّل ہے
سکھلائی غزل نے ہی شیریں سخنی پہلے

○

○

یہ نیم باز تری انکھڑیوں کے میخانے
نظر ملے تو چھلک جائیں دل کے پیمانے
شرابِ شوق سے لبریز ہیں لبوں کے پیمانے
تری نگاہ کو ایسے میں کون پہچانے
کہیں کلی نے تبسم کا راز سمجھا ہے
جو خود چمن ہے وہ اپنی بہار کیا جانے
جو ہوش میں تھا تو کوئی نہ مے بجام آیا
بہک گیا ہوں تو دنیا چلی ہے سمجھانے
عجب نہیں جو محبت مجھے سمجھ نہ سکے
وہ اجنبی ہوں جسے زیست بھی نہ پہچانے

یہیں سجود محبت کی بستیاں تھیں کبھی
بتا رہے ہیں یہ دیر و حرم کے ویرانے

کہیں چراغ جلانے کی ہو رہی ہے سبیل
بجھا رہے ہیں یہاں شمع خود ہی پروانے

فریب مشرق و مغرب ہیں رہروانِ جدید
یہ بدنصیب نہ عاقل ہوئے نہ دیوانے

وہ زندہ ہے جو بہے موج وقت کی رو میں
وہ زندہ تر ہے جو طوفاں میں ٹھہرنا جانے

میں اپنی بزم سے اتنا ہی دور ہوں کہ نشورؔ
مری نواؤں سے کچھ آشنا ہیں بیگانے

○

○

نگاہ حاصلِ رعنائیِ دو عالم ہے
وصال اگر نہیں ممکن نظارہ کیا کم ہے

وہ ایک قطرہ جو آنکھوں کا رنگ لے کے گرے
ہزار عالمِ رنگیں کا ایک عالم ہے

جہاں میں رہ کے ترا سجدہ بھول سکتا ہوں
ابھی ٹھہر کہ جبینِ نیاز برہم ہے

عنایتوں سے غمِ آرزو بدل نہ سکا
لپک رہی ہے تجلّی نگاہ محکم ہے

گنہ گنہ سے نیا اک جہان پیدا کر
نئی رگیں ہیں جوانی ہی خونِ آدم ہے

جمالِ باطنِ شاعر شبابِ لالہ و گل
جہاں ہے فطرتِ رنگیں حجاب بے دم ہے

نظر میں کیف بھی ٹھہرے تو بارِ غم ہی نشورؔ
خوشی وہی ہے یہاں جس کی زندگی گم ہے

○

○

دل کی تصویر حسن و رعنائی — سطح پر آگئی ہے گہرائی

شام غم اور ملال تنہائی — بڑی مشکل سے رات نیند آئی

پھول نے بھی ترے گلستاں سے — دل نہ پایا تو دل کشی پائی

ارتباطِ حیات بھی دیکھا — ایک محفل ہزار تنہائی

اک نفس وہ بھی غیر کا ممنون — زیست اس زندگی سے شرمائی

پھیکا پھیکا سا ہے تبسم گل — جیسے کھِل کر بہار پچھتائی

حُسن اک ناتمام سا اِقدام — عشق اک کامیاب پسپائی

بادۂ ناب و نرگسِ مخمور — مجھ سے پہلے شراب ٹھکرائی

دیکھتا ہوں نشورؔ شعروں میں
دل کی گیرائی غم کی گہرائی

○

○

غم خاموش جو یا اشک چکاں رکھتا ہوں
ایک ٹھہرے ہوئے دریا کو رواں رکھتا ہوں
اک بدلتی ہوئی دنیا کا سماں رکھتا ہوں
اُن کی جانب سے محبت کا گماں رکھتا ہوں

شوق تازہ ہو کہ، ہو حسرتِ بالیدہ کوئی
کچھ نہ کچھ سلسلۂ آہ و فغاں رکھتا ہوں

کچھ جھجکتی ہوئی نظریں ہیں خریدار جمیل
میں بھی پلکوں پہ ستاروں کی دکاں رکھتا ہوں

منتظر ہیں حرم و دیر کے گوشے یعنی
میں نے جو شمع جلائی ہے کہاں رکھتا ہوں

مصلحت ہے کہ ترا تیر نہ خالی جائے
ورنہ مٹھی میں ارادوں کی کماں رکھتا ہوں

غیر کے ہاتھ میں آزادی روشن کا چراغ
میں فقط مردہ چراغوں کا دھواں رکھتا ہوں

داغ ہوں لالۂ اقوامِ جہاں کے دل کا
میں بہاروں کے کلیجے پہ خزاں رکھتا ہوں

تیری بخشی ہوئی آزاد جبیں کی سوگند
ایک سجدہ بھی غلامی میں گراں رکھتا ہوں

کوئی منزل ہو مجھے آبلہ پائی سے ہے کام
کچھ زمیں کہتی ہے میں پاؤں جہاں رکھتا ہوں

انقلاباتِ دعزائم کے سنورنے کے لئے
ایک آئینہ پسِ لفظ و بیاں رکھتا ہوں

میری دنیا میں نہ کعبہ ہے نہ بتخانہ نشورؔ
دل کے گوشے میں مگر دیرِ مغاں رکھتا ہوں

○

○

ہزار شمع فروزاں ہو روشنی کے لئے
نظر نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کیلئے

تعلقات کی دنیا بھی آدمی کے لئے
اک اجنبی سا تصور ہے اجنبی کیلئے

چمن چمن ہی محبت جہاں جہاں ہی جمال
یہ اہتمام ہے اک دل کی زندگی کیلئے

شب نشاط، مبارک تجھے یہ ماہ و نجوم
سحر بہت ہے مری کم ستارگی کیلئے

نگاہ دوست سلامت کہ فیض گریہ سے
بہت گہر ہیں مرے دامن تہی کیلئے

نگاہ مست کی صہبا ٹپک رہی ہے نشورؔ
غزل کہی ہے طبیعت کی سرخوشی کیلئے

○

○

پنکھڑی کوئی گلستاں سے صبا کیا لائی
دور تک نکہتِ گل خاک اُڑاتی آئی

اُف وہ بیگانہ نگاہوں کی کرم فرمائی
فطرتِ عشق یہ انداز جنوں کھا آئی

تازہ تازہ وہ شکستِ سخن رعنائی
چپ ہوئے وہ تو تبسم کی جھلک سی آئی

آخر شب وہ ستاروں کی سسکتی ہوئی چھاؤں
میں وہیں بیٹھ گیا رات جہاں لہرائی

جاگی جاگی ہوئی پلکیں وہ بہ آغوش جمال
دل کو آرام زیادہ تھا تو کم نیند آئی

وقت نے ظرفِ نظر کو لبِ میخوار کیا
تشنگی شیشہ کو پیمانہ بنا کر لائی

زندگی ایک ہجوم گزراں ہے لیکن
آدمی اپنی جگہ عالمِ صد تنہائی

اپنے ہی شعلۂ رنگیں سے جلا دامنِ گل
اپنی ہی شاخِ تبسّم پہ کلی مرجھائی

منزلِ عقل جنوں رنگ اُسے ملتی ہے
جس نے اک بار رہِ عشق میں ٹھوکر کھائی

پتہ پتہ کا نہیں گلشنِ عالم میں جواب
ذرّہ ذرّہ میں دھڑکتا ہے دلِ یکتائی

ٹوٹتی سی رگِ دوراں یہ ترقی کی تھکن
کسی معشوق سحر خیز کی نیم انگڑائی

خاک اور خون سے اک شمع جلائی ہے نشور
موت سے ہم نے بھی سیکھی ہے حیات آرائی

○

○

محفل انساں میں کیوں بے رونقی پاتا ہوں میں
زندگی خالی ہے اور دنیا بھری پاتا ہوں میں
ہر ادا آرائشِ بے گانگی پاتا ہوں میں
ہر تبسم میں تعلق کی کمی پاتا ہوں میں
گل تبسم ریز ہیں لیکن چمن افسردہ ہے
شمع جلتی ہے مگر محفل بجھی پاتا ہوں میں
جل رہا ہے کس جگہ شامِ غریباں کا لہو
دُور تک پھیلی ہوئی اک روشنی پاتا ہوں میں
نازِ حسنِ دوست میں بے تاب ہے اک آرزو
دل کا اک عالم بقیدِ دلبری پاتا ہوں میں
روح کی وہ جلوہ سامانی نہیں ممکن نشور
زندگی جب خود برائے زندگی پاتا ہوں میں

○

○

چمن کو خار و خسِ آشیاں سے عار نہ ہو
کہیں گذشتہ بہاروں کی یادگار نہ ہو

ملی بہار جو کچھ رنگ و بو سے بیگانہ
وہ آ گئے کہ عناصر میں انتشار نہ ہو

چمک رہا ہے اندھیرے میں کاروبارِ حیات
نظر نظر ہو تو جینا بھی سازگار نہ ہو

یہ زلف و رخ یہ شب و روز یہ بہار و خزاں
وہ سلسلہ ہے کہ قطع نظر بھی بار نہ ہو

یہ تار و پود نظامِ خرد بکھر کے رہے
جنوں بقدرِ تجلّی جو ہوشیار نہ ہو

یہ ڈر رہا ہوں میں تکرارِ موسمِ گل سے
مٹا ہوا کوئی عالم پھر آشکار نہ ہو

یہ آرزو ہے کہ خوش فہمیٔ طلب ہی نشورؔ
امید کیا ہے جو دنیا امیدوار نہ ہو

○

○

عشق اک ربط سادہ ہوتا ہے — محشر بے ارادہ ہوتا ہے
حُسن جتنا ہی سادہ ہوتا ہے — گیسوئے ناکشادہ ہوتا ہے
جب کبھی شغل بادہ ہوتا ہے — ایک عالم زیادہ ہوتا ہے
جب وہ آتے ہیں زندگی کے قریب — دل بھی دُور افتادہ ہوتا ہے
کیا خبر یہ فشردۂ انگور — کتنا خوں ہو کے بادہ ہوتا ہے
مرگ کرتی ہے جبکہ دربانی — زیست کا در کشادہ ہوتا ہے
اُن کا جلوہ نہ دُور ہے نہ قریب — نور ہے کم نہ زیادہ ہوتا ہے
راہ احساس بےکسی مت پوچھ — کوئی منزل نہ جادہ ہوتا ہے
حُسن ہوتا ہے سادہ و رنگیں — عشق رنگین و سادہ ہوتا ہے

گنگناتا ہوں فرصتوں میں نشورؔ
شعر تنہائی زادہ ہوتا ہے

○

○

نہیں حسن اب شمعِ فانوس خانہ
یہ گیسو بکھرتے ہیں شانہ بشانہ

بہت کم تھی عمرِ نگاہ و تبسم
سحر تک نہ تھا التفاتِ شبانہ

مرے آنسوؤں کی ادا کون سمجھے
گلوں کا تبسّم نہ سمجھا زمانہ

کسی شام نے ان کے گیسو جو کھولے
میں بھولا نسیمِ سحر کا فسانہ

نشورؔ اب غزل ہے حیاتِ دو عالم
یہ عنوانِ زلف و کمر اک بہانہ

○

○

میکدہ آج سے ہے ملکِ عوام اے ساقی
ایک جام اور دے جمہور کے نام اے ساقی

کون لالہ کی طرح داغ جگر رکھتا ہے
کون لے تازہ بہاروں کا سلام اے ساقی

کوئی آنسو کوئی شبنم کوئی آکاش کی بوند
کوئی قطرہ نہیں دریا کا غلام اے ساقی

شور ہر سمت ہے جمہور کی آزادی کا
مَے اُبلتی ہے اگر ہوتی ہے خام اے ساقی

نہ پیالوں میں شراب اور نہ محفل میں چراغ
تو نے دیکھی ہے غریبوں کی بھی شام اے ساقی

مَے تو ہے ایک مگر ہوتی ہے تقسیم کے بعد
ساغرِ شیخ و برہمن میں حرام اے ساقی

اور ہوں گے جنھیں صہبا کا تقاضا ہوگا
ہم کو خالی ہی پیالے سے ہے کام اے ساقی

ہیرے اور شیشے کا مول ایک ہے، بازاروں میں
جوہری ہوں تو جواہر کے ہیں دام اے ساقی

○

وہ خزاں ہو یا کہ بہار ہو تجھے جاگنے کا پیام ہے
کہیں سو گیا ہو جو باغباں تو چمن کو نیند حرام ہے

یہی بال و پر ہیں کمند غم اگر احتیاط کمیں نہ ہو
تو قفس سے چھوٹ گیا تو کیا کہ قریب ہی وہی دام ہے

یہ تھکا تھکا ہوا کارواں نہیں آشنائے سبک روی
تو سنبھل سنبھل کے قدم اٹھا کہ زمانہ تیز خرام ہے

وہ جنازہ کوئی اٹھا سکے کہ پیالہ کوئی بڑھا سکے
جو کسی کے ہاتھ سے مل سکے وہی پھول ہے وہی جام ہے

جو نشور ان کو قبول ہو تو فضا میں اشک بکھیر دوں
جو ہمیشہ خاک بسر رہے انھیں گیسوؤں کو سلام ہے

○

○

زاہد اسیرِ گیسوئے جاناں نہ ہو سکا
جو مطمئن ہوا وہ پریشاں نہ ہو سکا
قیدِ خودی میں آدمی انساں نہ ہو سکا
ذرّہ سمٹ گیا تو بیاباں نہ ہو سکا
دامن تک آکے چاکِ گریباں بھی رہ گیا
اندازۂ بہارِ گلستاں نہ ہو سکا
خونِ دل و جگر نہ تبسم بنا نہ اشک
مضمونِ آرزو کوئی عنواں نہ ہو سکا
مرنا تو ایک بار ہوا سہل بھی مگر
جینا کسی طرح کبھی آساں نہ ہو سکا
بڑھتا ہی جا رہا ہے زمانے کا اضطراب
دنیا کے درد کا کوئی درماں نہ ہو سکا
مستقبلِ حیات کے عرفاں سے ہیں نشورؔ
اس دورِ پُرفریب کا انساں نہ ہو سکا

○

# یومِ آزادی

بنا کعبے نے بت خانے کی ڈالی — بتوں نے پھر تری دنیا سنبھالی
چمن کا سبزۂ خوابیدہ ہوں میں — مبارک مجھ کو دورِ پائمالی
شکستِ زندگی بھی مصلحت ہے — خضر نے پھر یہ کشتی توڑ ڈالی
چمن پر ہنس رہے ہیں غنچہ و گل — کہاں سوتے ہیں اس گلشن کے مالی
مرے سینے میں ہے جوشِ عزائم — یہ اندازِ ہجومِ خستہ حالی
یہ بازو انقلابات آزما ہیں — زوال آگہ ہے میری لازوالی
چمن زاروں میں پھر روتی ہے شبنم — یہ اشکِ دیدۂ اقبالؔ و حالیؔ

سیاست ایک دورِ برق و باراں
محبت ایک ذوقِ لایزالی

○

مری رات کا اک سکوں تاب عالم
پریشاں ہے اُن کے پسِ دوش گویا

وہ نظریں، ہیں صبر آزمائے تمنا
وہ جلوہ ہے غارتگرِ ہوش گویا

ابھی غم فزا کروٹوں میں ہے باقی
گدازِ شبستانِ آغوش گویا

ابھی خوابِ رنگیں میں ڈوبی ہوئی ہے
وہ مژگانِ گلنار و گلپوش گویا

دلوں کی پرکھ ہے یہ حسنِ تغافل
وہ طرزِ ملاقاتِ کم جوش گویا

لرزتی ہوئی موجِ مے ہے وہ دامن
گریزاں ہے اندازِ مے نوش گویا

کلی مسکرائی لبِ نیم وا پر
فضا ہو گئی نیم خاموش گویا

نشور اب مری غفلتیں آگہی ہیں
زمانہ ہے صد ساغرِ ہوش گویا

رگ رگ سی ٹوٹتی ہے شبِ غم میں رات کی
انگڑائیوں میں کتنی تھکن ہے حیات کی

نظروں میں ہے شراب دوگونہ ملی جُلی
کچھ زندگی کی، کچھ کششِ بے ثبات کی

میں چُپ رہا تو وہ بھی تکلف سے چُپ رہے
میں نے جو بات کی تو تغافل نے بات کی

جب حُسن نے نقاب کا گوشہ اُلٹ دیا
دھجی اڑا دی آئینۂ شش جہات کی

زلفِ سیاہ تا کمر و دوش منتشر
جیسے کوئی دراز حکایت ہو رات کی

رقصاں ہے جیسے میرے دلِ مضطرب کے پاس
گل پیرہن سی ایک تمنا حیات کی

جب تلخیِ شباب میں آیا ترا خیال
شاخیں لچک لچک سی گئی ہیں نبات کی

وقتِ سحر خمارِ مئے جام کچھ نہ پوچھ
دن میں مزا نہیں ہے حکایت میں رات کی

مستی بھی اک خمار ہے آلام کا نشورؔ
ہنسی بھی اک ادا ہے غمِ کائنات کی

○

زندگی راہ بے راہ چلتی رہی ٹھوکریں کھا کے دنیا سنبھلتی رہی
بزم خود کام تھی منتشر ہو گئی شمع بے لوث جلتی تھی جلتی رہی
رات کے قافلے دور پہنچے نہیں صبح مخمور تھی آنکھ ملتی رہی
کتنی بے درد تھی محفلِ رنگ و بو غم برستا رہا مے اُبلتی رہی
لغزشوں کو مواقع ملے زیست کے حادثے سو گئے موت ٹلتی رہی
کچھ لہو کچھ شفق کچھ کواکب بنی میری شامِ الم رُت بدلتی رہی
میری دیوانگی میری فرزانگی انقلاب و عزائم میں پلتی رہی
موج مردہ تھی گرداب خوابیدہ تھا ناؤ کاغذ کی تا دیر چلتی رہی

زندگی کیا نشورؔ اپنی گزری یہاں
سانس چلتی تھی رک رک کے چلتی رہی

○

○

تجلیوں سے غم اعتبار لے کے اٹھا
سکوں نہیں تھا تو دل کا قرار لے کے اٹھا
گزرنے والے مسافر سے کی امید وفا
ہر ایک رہ سے کوئی انتظار لے کے اٹھا
کیے جنوں میں یہاں تک سجود مجبوری
کہ آستاں سے ترے اختیار لے کے اٹھا
چمن میں غم کی بہاریں گزار دیں میں نے
وہاں سے اپنے نشیمن کے خار لے کے اٹھا
خزاں نصیب ہے دنیا اُسے خبر کیا ہے
بہار لے کے جو بیٹھا بہار لے کے اٹھا
چمن سے کیوں نہ تعلق ہو صورتِ شبنم
وہ گر پڑا جو علائق کا بار لے کے اٹھا
حیات جبر ہے ہر رنگ میں ثبات نشورؔ
جو سنگ ہو کے بھی بیٹھا شرار لے کے اٹھا

○

فکرِ نو ذوقِ تپاں سے آئی ہے
گرد تھوڑی کارواں سے آئی ہے

زندگی پرچھائیاں اپنی لئے
آئینوں کے درمیاں سے آئی ہے

سیکھ کر جادو وہ چشمِ میفروش
محفلِ جادوگراں سے آئی ہے

رات کے افسوں جگاتے ہی رہے
نیند اپنی داستاں سے آئی ہے

ہو لئے ہم زندگی کے ساتھ ساتھ
یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے

داغہائے سینہ میں یہ تازگی
التفاتِ ناگہاں سے آئی ہے

کیا خبر تجھ کو اسیرِ نوبہار
کتنی رعنائی خزاں سے آئی ہے

انقلابِ نو میں یہ قوتِ نشور
میرے دستِ ناتواں سے آئی ہے

○

نظمِ شرابخانہ تو برہم نہ ہو سکے
ساقی کوئی ہو فیضِ نظر کم نہ ہو سکے

رندانِ مے پرست کی کم فرصتی نہ پوچھ
اکثر شریکِ بزمِ دو عالم نہ ہو سکے

اے کم نصیب لذتِ آلامِ روزگار
غم اس لئے دیا کہ تجھے غم نہ ہو سکے

روحِ بہار و نورِ کواکب، رمِ حیات
انساں نہ ہو تو حسن مجسم نہ ہو سکے

میخانۂ حیات کے یہ رند کم نگاہ
اٹھے تھے جام لے کے مگر جم نہ ہو سکے

اب غم کو جستجو ہے اک ایسی نگاہ کی
جو ان کے التفات کا عالم نہ ہو سکے

شاعر کی زندگی جو نہ ہو داشکن نشورؔ
سامانِ اشک و آہ فراہم نہ ہو سکے

○

○

گناہ گار تو رحمت کو منہ دکھا نہ سکا
جو بے گناہ تھا وہ بھی نظر ملا نہ سکا

طرب ہے شیوۂ رندانِ عاقبت نشناس
جو گل نہ تھا وہ گلستاں میں مسکرا نہ سکا

بہت خفیف تھی کون و مکاں کی جلوہ گری
مری نگاہ کا گوشہ بھی جگمگا نہ سکا

حوالۂ نگہہِ شرمگیں ہوئیں آخر
وہ بجلیاں جو کہیں آسماں گرا نہ سکا

بدیعہ کار ہے ذہنِ خرد پسند، مگر
تصورات سے تصویرِ غم بنا نہ سکا

عجب نہیں کہ گلستاں میں پا یہ گل ہی سجائے
وہ بدنصیب جو رمزِ خرام پا نہ سکا

حیا وہ پاک جو رکھتا تھا خارِ پیراہن
جو گل بہ جیب تھا دامن کبھی بچا نہ سکا

نشورؔ ناز کی طبع شعر کیا کہئے
جہاں میں رہ کے زمانے کے ناز اٹھا نہ سکا

○

○

نظر نظر کو ساقی حیات کہتے آئے ہیں
اُن انکھڑیوں کو میکدہ کی رات کہتے آئے ہیں

بچاشنیِ عہدِ نَو جو بات کہتے آئے ہیں
غمِ جہاں کو دل کی کائنات کہتے آئے ہیں

فریبِ شوق کو تخیلات کہتے آئے ہیں
بکھر گئے تو گیسوؤں کو رات کہتے آئے ہیں

اُسی کو زندگی کا ساز دیکھے مطمئن ہوں میں
وہ حُسن جس کو حُسنِ بے ثبات کہتے آئے ہیں

یہ مخلصانِ عشق بھی عجب ادا پرست ہیں
وہ مسکرا دیے تو التفات کہتے آئے ہیں

حیات تا ممات ایک سلسلہ ہے عشق کا
کہاں ہیں وہ جو مرگ کو نجات کہتے آئے ہیں

نہ زاہدوں کے وعظِ ترکِ عشق پر ہنسے کوئی
یہ بے خبر بھی حوصلے کی بات کہتے آئے ہیں

یہ ظرف بادہ کیا ہے بادہ آشنا سے پوچھئے
ہم اس کو شیشۂ تجلّیات کہتے آئے ہیں

غزل ہے نام حُسن کے معاملاتِ خام کا
خطا ہوئی کہ دلبروں کی بات کہتے آئے ہیں

سکون و خواب زندگی کی راہ میں کہاں نشورؔ
حیات کو مسافرت کی رات کہتے آئے ہیں

○

○

اک دامنِ رنگیں لہرایا مستی سی فضا میں چھا ہی گئی
جب سیرِ چمن کو وہ نکلے پھولوں کی جبیں شرما ہی گئی

یہ صحنِ چمن یہ باغِ جہاں خالی تو نہ تھا نکہت سے مگر
کچھ دامنِ گل سے دور تھا میں کچھ بادِ صبا کترا ہی گئی

احساسِ الم اور پاسِ حیا اس وقت کا آنسو صہبا ہے
اُس چشمِ حسیں کو کیا کہیئے جب پی نہ سکی چھلکا ہی گئی

خود بیں تھا مزاجِ حسن مگر دامانِ محبت چھو ہی گیا
اندازِ تغافل کچھ بھی سہی کچھ اُن کی نظر فرما ہی گئی

ہر شعلہ گرِ عہدِ ظلمت، انجام سے اپنے ڈرتا ہے
جب ذکرِ سحر محفل میں چھڑا کچھ شمع کی لو تھرا ہی گئی

اس دور میں کتنے شیخِ حرم میخانہ کا رستہ پوچھ گئے
ساقی کی نظر بیگانہ سہی کچھ کارِ جہاں سمجھا ہی گئی

اک آہ جو شعلہ بار ہوئی عالم میں شرارے پھیل گئے
اک موج جو مضطر ہو کے اٹھی دریا کا لہو گرما ہی گئی

تہذیب کے رعنا پیکر سے یہ بارِ امانت اٹھ نہ سکا
ناطورۂ عہدِ حاضر کی نازک تھی کمر بل کھا ہی گئی

زہرابِ زمانہ پی پی کر جو اہلِ جنوں تھے راہ لگے
شاعر کو نشورؔ اک زلفِ دوتا غم دے نہ سکی الجھا ہی گئی

○

○

تخیّل رقص کرتا ہے تجلّی چھائی ہوتی ہے
میں شاعر ہوں بہت رنگیں مری تنہائی ہوتی ہے
کوئی بھولی ہوئی سی یاد اس دم آئی ہوتی ہے
مرے کاندھے پہ جیسے دم زلفِ شب لہرائی ہوتی ہے
گزر جاتا ہوں مرگ و زیست کی فرسودہ راہوں سے
ٹھہرتا ہوں جہاں، اک منزلِ رعنائی ہوتی ہے
یہ دل بھی کچھ عجب دیوانہ رُو ہے ابتدا ہی سے
وہیں جاتا ہے جس رستہ پہ ٹھوکر کھائی ہوتی ہے
نشورؔ اس عہد میں دوشِ خزاں پر ہیں بہاریں بھی
کہ اس محفل میں پھولوں کی ہنسی مرجھائی ہوتی ہے

○

○

مضطرب فطرت انساں تپشِ گام سے ہے
ورنہ منزل پہ ہر اک قافلہ آرام سے ہے

پھیکا پھیکا سا ہے اشکوں کی زبانی غم دل
عشرتِ راہِ طلب شکوۂ ناکام سے ہے

ڈر ہے بجھ جائے نہ انوارِ سحر سے پہلے
وہ دیا جس کی کہ لو تیز سرِ شام سے ہے

آستانہ جو ترا دیر و حرم سے ہے بلند
ہمت کے سجدہ بھی مرا کچھ روشِ عام سے ہے

لفظ میں کیف ہے شاعر کے تصور کا نہیں
شاعری روح فزا پرتوِ الہام سے ہے

○

O

بہار چھپ نہیں سکی گل وسمن پکار اُٹھے
جو حُسن جلوہ ریز ہو تو پیرہن پکار اُٹھے

طلوع انقلاب کے لئے جو مضطرب تھے دل
جو رات بھی چمک اٹھی کرن کرن پکار اٹھے

خیال ان کا رنگ لے تو دل دھڑک دھڑک اٹھیں
وہ انجمن فروز ہوں تو انجمن پکار اٹھے

کہا یہ کس نے حسن سے کہ پھر سبک خرام ہو
بایں ادائے سادگی کہ بانکپن پکار اٹھے

یہ بجلیوں کا تھا کرم، گل و بہار و باغ پر
کہ آشیاں پرست بھی چمن چمن پکار اٹھے

الم کوئی گنہ نہیں کہ مدتوں رہے چھپا
جبینِ غم پہ بل پڑے تو ہر شکن پکار اٹھے

یہ میکدوں میں اندنوں کمی ہے لعل ناب کی
نئی ادا کے بادہ کش مئے کہن پکار اٹھے

وجود چھن گیا مگر حیات چُپ نہیں رہی
گزر کے بھی شہیدِ غم پسِ کفن پکار اٹھے

کچھ اس طرح کی گرد اٹھی کہ راہ عمر کھو گئی
لُٹا کچھ ایسا کارواں کہ راہزن پکار اٹھے

فضائے نظم تازہ ہے نشورؔ ان دنوں مگر
چھٹا جو دامنِ غزل تو اہل فن پکار اٹھے

○

جانبازوں کے لب پر بھی اب عیش کا نام آیا
جس ہاتھ میں تیشہ تھا اس ہاتھ میں جام آیا

اک تازہ تغیّر ہے تہذیب کی دنیا میں
یا حُسن حقیقی کو انداز خرام آیا

راحت کا تصوّر ہی باقی نہ رہا شاید
ہونٹوں پہ تکلّف سے آرام کا نام آیا

کچھ سوچ کے اک راہِ پُرخار سے گزرا تھا
کانٹے بھی نہ راس آئے دامن بھی نہ کام آیا

ساقی بھی حریفوں کو پہچان کے دیتا ہے
جب بزم سے ہم نکلے تب دور میں جام آیا

اس تیرہ نصیبی میں کرنوں کا سہارا کیا
سورج کی طرف دیکھا وہ بھی لبِ بام آیا

یہ رازِ نیازِ غم کچھ وہ بھی سمجھتے ہیں
جب چوٹ پڑی دل پر پلکوں کو سلام آیا
غم اور خوشی دونوں ہر روز کے مہماں ہیں
یہ صبح بہ صبح آئی وہ شام بہ شام آیا
پھینکے ہوئے شیشوں سے دل کتنے بنائے ہیں
جب جام کوئی ٹوٹا دیوانوں کے کام آیا
کانوں میں کچھ آتی ہے آواز پھڑکنے کی
پھر کوئی نیا طائر شاید تہہِ دام آیا
اشعار نشورؔ اکثر اُن کی بھی زباں پر ہیں
چپ رہ نہ سکا کوئی جب وقتِ کلام آیا

○

○

شاید کہ نظر پہنچے یزدیِ غم انساں تک
اے صبح چمن پہ دور چل شام غریباں تک

مٹی سے کرن تک ہے اک عشق کی تابانی
یا حسن کا جادو ہے شبنم سے شبستاں تک

ٹوٹی ہوئی کشتی کا اس دور میں کیا شکوہ
ساحل پہ یہ رونق ہے اندازۂ طوفاں تک

ویرانی رنگیں ہے یا رنگ پہ ویرانہ
بس ایک حکایت ہے گلشن سے بیاباں تک

کیوں دامن احساں کا گھبرا کے سہارا لوں
جب ہاتھ پہنچتا ہے ظالم کے گریباں تک

اُن مست نگاہوں کے فتنہ کا یقیں کر لو
یا ساتھ چلو میرے اُس آئنہ ساماں تک

○

○

سمجھو تو یہ بھی تنگیٔ چشمِ بہار ہے
شبنم کو زندگی کی کرن ناگوار ہے
ساقی تو اس نگاہ سے دل کی طرف نہ دیکھ
یوں ہی شکستہ شیشۂ لیل و نہار ہے
جوشِ عوام سے ہیں پریشاں سکوں پسند
موجوں کا اضطراب بھی ساحل پہ بار ہے
پیچھے نہ رہ گیا ہو کہیں میرِ کارواں
جو قافلے کے ساتھ اڑا وہ غبار ہے
اس دور میں کہیں بھی ٹھکانا نہیں نشورؔ
شاعر وطن میں رہ کے غریب الدیار ہے

○

○

ٹھکرائے ہوئے دل کی یاد آئی تو کیا آئی
پھینکا ہوا شیشہ تھا ٹوٹا تو صدا آئی

دن ذوقِ نوازش سے بیگانہ سہی لیکن
جلوہ ہے نہ شعلہ ہے رات آئی تو کیا آئی

عشرت گہہ باطل کی رونق میں کمی کیا ہے
گر بادِ صبا جا کر اک شمع بجھا آئی

بڑھتی ہوئی بیتابی کچھ روٹھ گئی شاید
جھٹکے ہوئے دامن سے ہاتھوں کو حیا آئی

اٹھتا ہے قدم لیکن رفتار غنودہ ہے
نیند آ گئی رستوں کو منزل کی ہوا آئی

ہے کچھ تو نشورؔ احساں اس عمرِ رواں کا بھی
اک روز کنارے پر کشتی تو لگا آئی

○

نگاہ مست سے اخذِ غم حیات کرے
خبر نہ ہو تو کسی بے خبر سے بات کرے

کہاں فلک کے شرارے کہاں زمیں کے نجوم
وہ کچھ دنوں ابھی مشقِ تجلیات کرے

کچھ اس نگاہ سے بچکر گزر رہی ہے حیات
نظر ملے تو ہر اک شے کو بے ثبات کرے

یہ اک جہان تو اب تک سنبھل سکا ہی نہیں
کسے پڑی ہے کہ پھر کُن سے کائنات کرے

حریف عمر گریزاں ہے وہ گدائے شراب
جو بند شیشے میں اک لمحۂ حیات کرے

نہ ہو امید تو یہ تیرگی بزمِ حیات
جہاں سے دن نہ نکلتا وہیں سے رات کرے

نگاہ حسن سے محجوب التفات مگر
کبھی کبھی تو کسی اجنبی سے بات کرے

مری شراب سے جیب بہ جبیں نہ ہو واعظ
خدا تجھے بھی کبھی رند خوش صفات کرے

جب اک ادائے تغافل پہ خوش ہیں اہلِ جنوں
انھیں بھی کیوں کوئی پابندِ التفات کرے

نہیں ہے شاعرِ فطرت پہ کوئی قیدِ نشور
مگر کبھی تو نظر سوئے واقعات کرے

○

# دِلّی کی زبان

اُردو کو یوں ہی سحر رواں کہتے رہیں گے
دلّی ہے تو دلّی کی زباں کہتے رہیں گے

ترتیب خیالات کو شاعر کی زباں میں
گُلدستۂ نازک کمراں کہتے رہیں گے

بے سود ہے ہر آہ رسا بزم طرب میں
گوش گل رنگیں کو گراں کہتے رہیں گے

پہچان گیا اہل سیاست کی زباں بھی
یہ آگ لگی ہو تو دھواں کہتے رہیں گے

اس دور میں جو لوگ ہیں نبّاض گلستاں
پھولوں کو بھی شبنم کی دُکاں کہتے رہیں گے

○

○

میکدہ کی جانب چل زندگی ہے مستی ہے
نقدِ عاقلی دے کر مے ملے تو سستی ہے

ہیں زمیں کے ذرے بھی سیرِ ماہ و انجم میں
کس قدر بلندی پر آج کل کی پستی ہے

کارواں کے دیوانے اس جگہ نہ منزل کر
شہرِ کم چراغاں ہے رہبروں کی بستی ہے

دربدر حرم والے سجدہ ریز ملتے ہیں
بت نہیں رہے لیکن ذوقِ بت پرستی ہے

میری کشتِ ویراں تک ابر ہے تو آئے گا
میں گھٹا سے کیوں پوچھوں تو کہاں برستی ہے

طُور کچھ نہیں لیکن مُنکرِ تجلّیِ حُسن
عشق ہے تو ہستی ہے حُسن ہے تو ہستی ہے

مانع نوازش ہے اک حسین تکلّف سا
کچھ حیا طرازی ہے کچھ حنا بدستی ہے

کاٹتی ہے تنہائی آرزو کے لمحوں میں
ناگ جیسے پالے ہیں رات جیسے ڈستی ہے

لُٹ رہے ہیں بے منّت اب نشورؔ گنجینے
زندگی جو مہنگی ہے شاعری بھی سستی ہے

○

○

اہلِ کمال کا ہے پتہ تیرگیِ غم
ڈھونڈو وہیں چراغ اندھیرا جو گھر ملے
برق گریز پا کا تبسّم ہے یہ حیات
شکوہ نہ کر اگر نگہِ مختصر ملے
یوں ہو گیا ہے راہ میں عصرِ رواں کا ساتھ
جیسے کوئی حسین کہیں ہم سفر ملے
پروردۂ ہزار قیامت ہے حسنِ دوست
فتنے بہت اٹھے ہیں تو کچھ فتنہ گر ملے
ہر راہ میں ہے گنجِ شہیدانِ انقلاب
وہ وقت ہے کہ سنگ اٹھاؤ تو سر ملے

○

مرا دل نہ تھا اَلَم آشنا کہ تری ادا پہ نظر پڑی
وہ نہ جانے کون سا وقت تھا کہ بنائے خونِ جگر پڑی

جسے چاہے مالکِ رنگ و بو اسی بے رُخی میں نواز دے
میں اِدھر تھا منتظرِ کرم، وہ نگاہ ناز اُدھر پڑی

ترا کام سیرِ مُدام ہے نہ کہ گلستانوں میں ٹھیرنا
یہ کلی کلی کے فریب میں تو کہاں سے بادِ سحر پڑی

کوئی موج بحر سے دُور ہے تو جبینِ بحر پہ کیا شکن
تری رحمتوں کو ہوا یہ کیا مری لغزشوں پہ نظر پڑی

تجھے کیا ہو قدرِ ملال کی تو ہے نارسیدۂ زندگی
جو بہت پھرے ہیں گلی گلی تو جبیں پہ گردِ سفر پڑی

سرِ راہ ان کو یہ یک نظر کبھی دیکھیے تو وہی ادا
وہی بے نیازیِ مہوشاں وہی زلف تا بہ کمر پڑی

یہ نگاہِ ساقیِ مہر و مہ کبھی خالی جام نہیں رہی
میں زمیں پہ ڈھونڈھ رہا تھا کچھ کہ وہ کہکشاں سے اتر پڑی

جو حدودِ صبح میں رُک گیا اِسے اتفاقِ سفر کہو
میں وہی مسافرِ شام ہوں مرے راستے میں سحر پڑی

○

آنسو مری پلکوں پہ شتاباں نہیں مِلتا
اس کوچہ میں ہر وقت چراغاں نہیں مِلتا
ساحل پہ جو تھا میرے قدم لیتی تھیں موجیں
اب ڈوبنے آیا ہوں تو طوفاں نہیں مِلتا
ویرانوں میں مرجھا گئے صد رنگ شگوفے
ہر پھول کو آغوشِ گلستاں نہیں مِلتا
کی خونِ جگر سے بھی زمانے کی تواضُع
پھر بھی تو مزاجِ غمِ دوراں نہیں مِلتا
لہجے سے نشورؔ اپنے عیاں ہے غمِ ہستی
اب شاعرِ فطرت بھی غزل خواں نہیں مِلتا

○

# نئی
# مشہور
# غزلیں

میں ابھی سے کس طرح انکو بیوفا کہوں
منزلوں کی بات ہے، راستے میں کیا کہوں

حسنِ بے حجاب پر کوئی پردہ ڈال لو
تم اُسے صنم کہو، میں اُسے خُدا کہوں

اے حریفِ میکدہ خونِ زندگی نہ پی
تو شراب اگر پیئے، تجھ کو پارسا کہوں

گیسوئے سیاہ کی یہ حسیں درازیاں
رات کیوں کہوں انھیں رات کی دعا کہوں

ترجمانِ راز ہوں یہ بھی کام ہے مرا
اُس لبِ خموش نے مجھ سے جو کہا، کہوں

غیر میرا حالِ غم پوچھتے رہے مگر
دوستوں کی بات ہے دشمنوں سے کیا کہوں

امتحانِ شوق ہے ایسی عاشقی نشورؔ
دل کا کوئی حال ہو اُن کو دلربا کہوں

○

پھر زلفِ مسلسل کی شکن جاگ پڑی ہے
پھر حُسن میں جادو کی کرن جاگ پڑی ہے

معلوم نہیں پھول ہیں یا نقشِ کفِ پا
گزرا ہے کوئی راہِ چمن جاگ پڑی ہے

اب دل کی نہیں خیر نہ لے نام وفا کا
پھر وہ نگہہِ وعدہ شکن جاگ پڑی ہے

پھر خون میں بیدار ہوا خوابِ حرارت
پھر غیرتِ اربابِ وطن جاگ پڑی ہے

اِس دَور کی تہذیب بھی اک نیند ہے گہری
کروٹ نہیں بدلی تو تھکن جاگ پڑی ہے

ساغر میں کوئی موج غنودہ نہ ملے گی
شیشوں میں بھی صہبائے کہن جاگ پڑی ہے

سُن سُن کے نشور آپ کے اشعارِ غم انگیز
بے خواب سا ہوں دل کی چُبھن جاگ پڑی ہے

○

یاد آتی رہی بھلا نہ سکے
شمع جلتی رہی بجھا نہ سکے

چاند تارے گل و چمن مل کر
دل کی اک داستاں سنا نہ سکے

آس باندھی تھی جن ستاروں سے
دیر تک وہ بھی جگمگا نہ سکے

نغمہ کیا، مطربانِ عہدِ جدید
تار ٹوٹے ہوئے ملا نہ سکے

آج وہ رہبر خلائق ہیں
خود کو جو آدمی بنا نہ سکے

پنجۂ گل سے بھی یہ متوالے
دامنِ زندگی چھڑا نہ سکے

غم کے مارے ہوئے قلوب نشور
درد کی سرحدوں کو پا نہ سکے

○

گلِ رنگیں میں شعلے پل رہے ہیں
گلستانوں میں دامن جل رہے ہیں

گئی دنیا مگر اربابِ دُنیا
ابھی تک دستِ حسرت مل رہے ہیں

یہ سب ٹوٹے ہوئے ساغر ہیں ساقی
یہ جب تک چل رہے ہیں چل رہے ہیں

پشیماں تھے زمانے کے ستم بھی
تری زلفوں میں جنبک بل رہے ہیں

ذرا اونچا ہوا ہے خورشیدِ محشر
کہ دیواروں میں سایے پل رہے ہیں

درونِ میکدہ کیا کام ان کا
جنابِ شیخ سب کو کھل رہے ہیں

نشورؔ اس دورِ طوفانِ خرد میں
چراغِ کعبہ اب تک جل رہے ہیں

○

○

تارکِ رسمِ جفا بھی اب ستم ڈھانے لگے
لیجیے اتری کمانوں سے بھی تیر آنے لگے

کیا تعجب ہے کہ ہر رنگِ چمن جلتے ہوئے
میرے اندازِ خزاں پر پھول برسانے لگے

گفتگو ہے ہوش کی اور جستجو ہے شوق کی
مجھ کو تو اہلِ خرد بھی جیسے دیوانے لگے

اپنی کمزوری بیاں کرتا ہے ہر دانش فروش
حضرتِ ناصح نہیں سمجھے تو سمجھانے لگے

زلفِ آرام دل وجاں ہو کہ مرگِ ناگہاں
ایک ہی ناگن ہے جس کاندھے پہ لہرانے لگے

ایک آنسو اور اس میں داستانِ صد ملال
کتنے دریا قطرۂ شبنم میں تھرانے لگے

روشنی کوئی ہو، ہوتی ہے محبّت آفریں
شمع کے پیچھے بھی ہیں دو چار پروانے لگے

ابتدا سے جو پلے تھے موج طوفاں خیز میں
جب وہی کشتی میں آبیٹھے تو چکرانے لگے

جادۂ غم میں مرے نقش قدم کو دیکھ کر
کارواں ٹھہرے ہوئے، آنے لگے جانے لگے

نیند کیسے آئے اس رنگیں تصوّر میں نشورؔ
رات کو جب دلرُباؤں کا خیال آنے لگے

○

○

تیز تر لہجۂ گفتار کیا ہے ہم نے
برگِ گُل کو کبھی تلوار کیا ہے ہم نے

شعلۂ تیغ کو آغوشِ نظر میں لے کر
زیست میں موت کو بھی پیار کیا ہے ہم نے

کتنے منصوروں کا خون دے کے ترے کوچے میں
احترامِ رسن و دار کیا ہے ہم نے

میکدہ والوں کو ساقی کا حوالہ دے کر
ایک آواز پہ ہشیار کیا ہے ہم نے

غیر کے خام ارادوں کو کیا ہے پسپا
عزم کو آہنی دیوار کیا ہے ہم نے

امن کہتے ہیں جسے روح ہے آزادی کی
ایک عالم کو خبردار کیا ہے ہم نے

غیر کو پہلے ہی پہچان لیا تھا لیکن
ہوش میں آنے کو اک وار کیا ہے ہم نے

خون کے داغ چٹانوں پہ جو پڑے ہیں نشورؔ
چوم کر لالۂ کہسار کیا ہے ہم نے

○

○

کبھی جھوٹے سہارے غم میں راس آیا نہیں کرتے
یہ بادل اُڑ کے آتے ہیں مگر سایا نہیں کرتے

یہی کانٹے تو کچھ خود دار ہیں صحنِ گلستاں میں
کہ شبنم کے لئے دامن تو پھیلایا نہیں کرتے

وہ لے لیں گوشۂ دامن میں اپنے یا فلک چُن لے
مری آنکھوں میں آنسو بار بار آیا نہیں کرتے

سلیقہ جن کو ہوتا ہے غمِ دوراں میں جینے کا
وہ یوں شیشے کو ہر پتھر سے ٹکرایا نہیں کرتے

جو قیمت جانتے ہیں گردِ راہ زندگانی کی
وہ ٹھکرائی ہوئی دنیا کو ٹھکرایا نہیں کرتے

قدم میخانہ میں رکھنا بھی کارِ پختہ کاراں ہے
جو پیمانہ اٹھاتے ہیں وہ تھرایا نہیں کرتے

نشورؔ اہلِ زمانہ بات پوچھو تو لرزتے ہیں،
وہ شاعر ہیں جو حق کہنے سے کترایا نہیں کرتے

○

○

دل ہے کہ محبت میں اپنا نہ پرایا ہے
کچھ سوچ کے اُس نے بھی دیوانہ بنایا ہے

جو وقت کہ گزرا ہے جذبات کے کوچے میں
کچھ راس نہیں آیا کچھ راس بھی آیا ہے

آساں نہیں یہ آنسو آیا ہے جو پلکوں پر
رگ رگ سے لہو لے کر دیپک سا جلایا ہے

اک ربط حسیں دیکھا بے ربطیِ عالم میں
ہنگامہ سہی لیکن ہنگامہ سجایا ہے

پہچان لیے ہم نے تیور غمِ دوراں کے
دنیا میں رہا لیکن دھوکا نہیں کھایا ہے

رہبر ہو کہ شاعر ہو کیا اپنی خبر اس کو
خود کچھ بھی نہیں سیکھا، دنیا کو سکھایا ہے

نغمہ ہے نشورؔ اپنا افسردۂ غم لیکن
احساس کی محفل میں کچھ رنگ تو آیا ہے

○

دھڑکنیں دل کی گنے خوں میں روانی مانگے
زندگی عشق کی اے دوست جوانی مانگے

پیش کر داغ اگر دل پہ کوئی کھایا ہو
عشق ہر عاشق صادق سے نشانی مانگے

زلف شبگوں ترے شانے پہ کھلی ناگن ہے
ڈس لے یہ جس کو نہ پھر اٹھ کے وہ پانی مانگے

آدمی عہد جوانی میں رہا منکرِ غم
اب غم دل کی خبر ہے تو جوانی مانگے

حُسن ہر گام پہ قائم کرے اک تازہ حجاب
عشق پردے کی یہ دیوار گرانی مانگے

دن کو سوتی ہے محبت کی کشش آنکھوں میں
رات کو چاند ستاروں کی کہانی مانگے

میکدہ میں مرے ساقی کا نیا حکم یہ ہے
شام کو پیاس لگے صبح کو پانی مانگے

دلبری پیشہ ہے یہ چور بھی اپنے دل کا
آنکھ ہر ایک حقیقت سے جُرانی مانگے

کیا نئے دوست نوازوں کا بھروسا ہے نشورؔ
دوستی ہے کہ رہ و رسم پرانی مانگے

○

پرانی بات ہے اور تازہ عنوانوں سے کہنا ہے
کہ ٹکرائیں نہیں گردش میں پیمانوں سے کہنا ہے
محبت زندگی ہر نغمہ ہے اس خاک کی نَے میں
خلاؤں میں یہ دل شاید ہو دیوانوں سے کہنا ہے
گلستانوں میں پھر فصل جنوں کو منتظر پایا
یہ دامن کام آئے اب گریبانوں سے کہنا ہے
ہوا جو ہم سے ٹکرائی وہیں اٹھکھیلیاں بھولی
ہمیں پہچان لیں پہلے یہ طوفانوں سے کہنا ہے
سراپا انتظارِ دستِ گلچیں ہے یہ شاخ گل
چمن میں کیا نہیں یہ تنگ دامانوں سے کہنا ہے
نشورؔ اشعار میں شاید ہمیں پہچان لے کوئی
جو اپنوں سے نہ کہہ پائے وہ بیگانوں سے کہنا ہے

○

○

جب بھی آزاد تمدّن کا سوال آیا ہے
پہلے انسان کی عظمت کا خیال آیا ہے
جس کو اس دور میں جینے کا خیال آیا ہے
موت کو سرحدِ ادراک پہ ڈال آیا ہے
درد و غم پر مرے ہنستے ہیں زمانے کے حسیں
جیسے احساسِ مروّت پہ زوال آیا ہے
تھا لہو تازہ محبّت کا رگوں میں جس کی
دُور تک قصۂ ماضی کو بھی ٹال آیا ہے
شاعری خود نگری ہے کہ وطن کا شاعر
خونِ دل اپنا زمانے میں اُچھال آیا ہے
خاک اور خون سے کھیلا ہے ہر اک فرد نشورؔ
جب کسی قوم کی عزّت کا سوال آیا ہے

ہجومِ بے رُخی میں حسنِ ظن کی آزمائش ہے
وفا کیسی مرے دیوانہ پن کی آزمائش ہے

دلوں کا توڑنا سیکھا ہے جس کی بے نیازی نے
محبت میں اُسی خاطر شکن کی آزمائش ہے

امینِ انتظار گام ہے راہوں کی خاموشی
زمانہ کچھ نہیں تیرے چلن کی آزمائش ہے

یہ انسانوں کے بیجاں قافلے اور دُوری منزل
کہاں تک ساتھ چل سکتا ہے فن کی آزمائش ہے

جہاں چھینٹیں لہو کی آ گئیں دامانِ انساں پر
وہیں صفحاتِ تاریخِ وطن کی آزمائش ہے

بھڑک اُٹھا فریبِ شب کہ چھوڑے صبح کا دامن
سرِ محفل چراغِ انجمن کی آزمائش ہے

ہزاروں رنگ میں روح ایک ہی گلزار کی لیکن
بہ صد رنگی و یک رنگی چمن کی آزمائش ہے

نشورؔ اس عہدِ حاضر میں نئے جادو ہیں دانش کے
فسوں کاری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

○

عہدِ حاضر میں جسے دیدہ وری کہتے ہیں
تیرے دیوانے اُسے کم نظری کہتے ہیں
عشق کو پیشہ رندانِ ہنرمند کہو
دہر کو کارگہہ بے ہنری کہتے ہیں
برق سے مانگ کے لائے ہیں نگاہوں کا فریب
پر توِ مرگ کو آئینہ گری کہتے ہیں
آج رندانِ قدح خوار بھی ہیں بادہ فریب
ہوش رکھتے ہیں مگر بے خبری کہتے ہیں
باغبانوں کی نظر میں جو کلی پھولی تھی
ہم اُسے فصلِ گلستاں نظری کہتے ہیں
زندگی کھو کے بھی اربابِ خرد کو نہ ملی
وہ محبت جسے شوریدہ سری کہتے ہیں
رات کے چاند ستاروں کو خبر کیا ہے نشورؔ
ہم جو افسانہ بہ آہِ سحری کہتے ہیں

○

ماتم وغمِ خزاں تا چمن اِدھر بھی ہے
بوئے گُل کا، کارواں، بے وطن اِدھر بھی ہے
حُسن اگر ہے اُس طرف محوِ نازِ دلبری
عشق کے مزاج میں بانکپن اِدھر بھی ہے
شکوہ ہائے تو بہ تو سُن کے مُسکرا دیے
وہ لبِ حسیں ابھی کم سخن اِدھر بھی ہے
بخیہ کارِ وقت کو فرصتِ نظر کہاں
تار تار زیست کا پیرہن اِدھر بھی ہے
تیرے وعدے کا یقین ہے نشورؔ کو تو ہو
اپنا دل تو بدگماں جانِ من اِدھر بھی ہے

○

# بہادر شاہ ظفر

اے حریفِ چشمِ تر تجھ پر سلام　　شاعرِ دردِ و اثر تجھ پر سلام
ہے لہو کے رنگ سے تیرا اجال　　جادۂ خونِ جگر تجھ پر سلام
اے مسافر اے مُہاجر اے اسیر　　اے مرے شاہِ ظفر تجھ پر سلام
دیکھنا تھا آنے والی جنگ کو　　قائدِ اہلِ نظر تجھ پر سلام
جنگِ آزادی کا تھا رہنما　　فخرِ راہ و راہبر تجھ پر سلام
ہے ترا پہلا سفر درسِ حیات
محوِ ایجادِ سفر تجھ پر سلام

○

میخانے میں بڑھتی گئی تفریقِ نہاں اَور
شیشے کا بیاں اور ہے ساقی کا بیاں اَور
انکار حقیقت بھی ہے اک سیر حقیقت
ہوتا ہے یقیں اور تو بڑھتا ہے گماں اَور
رنگین فضاؤں میں ٹپکنے لگے آنسو
آیا ہوں گلستاں تو شبنم ہے چکاں اَور
اس درجہ بھی مایوس نہ دیکھی تھیں بہاریں
دنیا میں ہیں اے دوست بہت ملکِ خزاں اَور
ہر گام نشورؔ آبلہ پائی کا ہے عالم
کچھ دُور ہے یہ قافلۂ درد رواں اَور

# ماتم جواہر ۱۹۶۴ء

اشک جب مانگ کے شبنم کی دکاں سے آئے
خوں نہ کیوں دیدۂ خونابہ فشاں سے آئے

یہ سمجھ لو کہ کوئی تیز قدم گزرا ہے
گرد جب قافلۂ عمر رواں سے آئے

شہر خوباں کا یہ عالم ہے کہ صراف حیات
ہاتھ خالی ہی محبت کی دکاں سے آئے

بادہ لبریز ہو شیشے میں تو چھلکے صہبا
جام کیا انجمنِ شیشہ گراں سے آئے

کارنامے تھے جو اس کے نئی دنیا میں عظیم
وہ بھی سننے میں حریفوں کی زباں سے آئے

ایشیا آج ہے بے نور سی آنکھوں کی طرح
روشنی دیدۂ مشرق میں کہاں سے آئے

# جواہر کے بعد

ظلمتِ شام کا چرچا ہی رہے گا کچھ دن
چاند ڈوبا ہے اندھیرا ہی رہے گا کچھ دن
آستیں کام نہ آئے گی نہ دامن کوئی
اشک پلکوں پہ لرزتا ہی رہے گا کچھ دن
ہم نوا زیست کا ملتا ہے کہیں صدیوں میں
آدمی جیسے اکیلا ہی رہے گا کچھ دن
ہم سفر چیخ کے سو جائیں گے ہر منزل پر
کارواں زیست کا لُٹتا ہی رہے گا کچھ دن
غم بھی کھانا کوئی چاہے تو نہ ممکن ہو گا
آدمی دہر میں بھوکا ہی رہے گا کچھ دن
ختم اک دَور ہوا دوسرے دَور آنے تک
سانس رُک جانے کا دھڑکا ہی رہے گا کچھ دن
اس اندھیرے میں دیا کوئی ہے درکار نشور
دل جسے کہتے ہیں جلتا ہی رہے گا کچھ دن

سب کے لئے کشش مرے طرزِ سخن میں ہے
کیا جانے کیا ادا مرے دیوانہ پن میں ہے
ہیں سرزمینِ غیر کے جلوے بھی بے فروغ
وہ گرد بھی حسیں ہے جو اپنے چمن میں ہے
میری نظر کے سامنے پوچھو نہ اُن کا رنگ
آئینہ ہے جو صبح کی پہلی کرن میں ہے
شیشے میں کون روک سکا ہے کرن نشورؔ
شاعر نہیں ہے وہ جو گرفتارِ فن میں ہے

○

اشک پلکوں پہ نہ ٹھہرے تو مداوا کیا ہے
یہ بھی طوفان کی منزل ہے کنارا کیا ہے
عشق اک لمحہ ہے بے ماضی و بے مستقبل
شکوہ کیا چیز ہے یا وعدۂ فردا کیا ہے
وہ نگاہیں بھی پھریں جن سے تھی امیدِ وفا
کوئی سمجھا نہیں اے دوست کہ دنیا کیا ہے
ایک معصوم سی فطرت ہے تغیّر بہ کنار
دل بدل جائیں تو دنیا کا بدلنا کیا ہے
حُسن کیا چیز ہے پوچھو یہ مری نظروں سے
آئنہ ہاتھ سے رکھ دو ابھی دیکھا کیا ہے
حاصلِ زیست بجز دردِ طلب کیا ہے نشور
زندگی سے کسی فنکار نے پایا کیا ہے

○

# الجھن

لمحے اُلجھن کے قریب آپہونچے — سایے رہزن کے، قریب آپہونچے

آنسوؤں سے ہی بجھالے ناداں — شعلے دامن کے قریب آپہونچے

شیشۂ مے جو کبھی رقص میں تھے — سنگ و آہن کے قریب آپہونچے

کون مجرم کو بچا سکتا ہے — ہاتھ دامن کے قریب آپہونچے

اب تو اپنوں پہ بھروسا نہ رہا — دوست دشمن کے قریب آپہونچے

شور سُن کر مری رُسوائی کا — وہ بھی چلمن کے قریب آپہونچے

ہم روایات کو پگھلا کے نشورؔ
اک نئے فن کے قریب آپہونچے

جو لوگ حقیقت کی ادا پائے ہوئے ہیں
ہر مصلحتِ وقت کو ٹھکرائے ہوئے ہیں
پھولوں کی طرح ہم بھی کھلے دل کے ہیں مالک
پیمانے میں جو کچھ بھی ہے چھلکائے ہوئے ہیں
راس آتی نہیں جن کو گلستاں کی فضا بھی
شاید کسی دامن کی ہوا کھائے ہوئے ہیں
انجام بہاراں کی انھیں فکر بہت ہے
دیوانہ ہوں میں اور وہ گھبرائے ہوئے ہیں
نام اس کا تبسّم ہو کہ اشکوں کا تسلسُل
دھوکا تو وہی ہے جو سبھی کھائے ہوئے ہیں
اس دَور کے رندوں کو زیاں کار نہ سمجھو
یہ لوگ بھی رحمت کا پتہ پائے ہوئے ہیں
شاعر کے خیالات نشورؔ اپنی حدوں میں
بادل ہیں بہت دُور تلک چھائے ہوئے ہیں

○

# ہند و چین

اے ہجوم عاشقانِ انقلاب ہوشیار از فتنۂ رنگیں نقاب
اپنی فطرت اک نگاہِ احتیاط اپنا شیوہ اک ادائے اجتناب
غیر جانب دار ہے دھرتی کا خون ناطرفداری ہے دنیا کا شباب
ایٹمی طاقت پہ نازاں ہے حریف ہند کی جمہوریت کا کیا جواب
اسلحہ کی قوتوں سے تیز تر ایکتا کا یہ ہجوم اضطراب
صلح کا پیغام اک آوازِ غیب امنِ عالم گیر اک روشن کتاب

اوّل اوّل نقش باطل کی نمود
حق ہمیشہ آخر آخر کامیاب

ہے فسونِ تیرہ شب ہم سائگی
سایہ گہرا ہو تو بہتر اجتناب

ہند کی جمہوریت کی روح میں
دیکھتا ہوں اک نئی دنیا کا خواب

کچھ دریچے دیکھتا ہوں برف میں
آگ کے شعلے ہیں اُن کا سدّباب

غیر کی بد نیتی میں شک نہیں
جس کی نیت ہو چکی ہے بے نقاب

اِس طرف اک شوکت آبادکار
اس طرف اک لشکرِ خانہ خراب

خون الگ تہذیب الگ تعمیر الگ
چین والوں سے یہاں کیا انتساب

مستقل ہے نغمۂ تیغ و تفنگ
عارضی ہے وقفۂ چنگ و رباب

○

# ہندو پاک کشمکش

ہر وطن پرور وطن کے ساتھ ہے
پھول کوئی ہو چمن کے ساتھ ہے

مختلف رنگوں کی یہ اک زندگی
روشنی بن کر کرن کے ساتھ ہے

اپنی تہذیب اپنی محفل کا سجاؤ
ربط شیخ و برہمن کے ساتھ ہے

وادیٔ کشمیر روشن ہم سے ہے
شمع اپنی انجمن کے ساتھ ہے

سب نے دیکھا ہے یہاں اس کا بہاؤ
یہ لہو گنگ و جمن کے ساتھ ہے

گفتگو ہو، صلح ہو یا جنگ ہو
جو ادا ہے بانکپن کے ساتھ ہے

صفحۂ تاریخ شاہد ہے نشورؔ
شرکت اپنی جان و تن کے ساتھ ہے

○

زیست ملتی ہے عمرِ فانی سے
مانگ کچھ اپنی زندگانی سے
اک نظر کا فسانہ ہے دنیا
سو کہانی ہے اک کہانی سے
بات کہہ دی تو بات کچھ نہ رہی
غم ہوا غم کی ترجمانی سے
صبح ہوتی نہیں محبت کی
رات کٹتی نہیں جوانی سے
پھول چُنتے ہیں اہلِ بزم نشورؔ
میری ہر تازہ گلفشانی سے

○

وقت کا قافلہ آتا ہے گزر جاتا ہے
آدمی اپنی ہی منزل میں ٹھہر جاتا ہے
ایک بگڑی ہوئی قسمت پہ نہ ہنسنا اے دوست
جانے کس وقت یہ انسان سنور جاتا ہے
اُس طرف عیش کی شمعیں تو اِدھر دل کے چراغ
دیکھنا یہ ہے کہ پروانہ کدھر جاتا ہے
جام و صہبا کی مجھے فکر نہیں اے غمِ دل
میرا پیمانہ تو اشکوں ہی سے بھر جاتا ہے
ایک رشتہ بھی محبت کا اگر ٹوٹ گیا
دیکھتے دیکھتے شیرازہ بکھر جاتا ہے
حال میرے لئے ہے لمحۂ آئندہ نشورؔ
وقت شاعر کے لئے پہلے گزر جاتا ہے

(تمام شد)

○